انتساب

گاندھی جی اور ڈاکٹر سیّد محمود کی

سب سے بڑی آرزو

ہندو مسلم اتحاد کے نام

فہرست مضامین

ڈاکٹر سیّد محمودؔ

دیباچہ

یہ کتاب ابتک شائع نہ ہوسکی ڈاکٹر صاحب نے اس کا ایک ٹائپ شدہ نسخہ مجھکو لا کر دیا تھا کہ میں اس کا اردو ترجمہ کر کے دارالمصنفین سے شائع کروں اسکو میں بہت ہی حفاظت سے مقفل کر کے رکھے ہوئے تھا کہ یکایک انھوں نے اسکو واپس منگوالیا اور بمبئی کے ناشر کے پاس بھیج دیا، مجھکو قلق ہے کہ میں اس کا گہرا مطالعہ نہ کرسکا، اور نہ اسکے بعض اہم خطوط کی نقل اسی وقت لے سکا، زیر نظر اوراق میں انہی خطوط میں سے بعض کو نقل کر دیتا تو ان سے نہ صرف ڈاکٹر صاحب کی اہمیت اور ان کی بہت سی سرگرمیوں کا اندازہ ہوتا بلکہ بعض مفید سیاسی معلومات بھی حاصل ہوتے،

خدا کرے آگے چل کر کوئی صاحب ڈاکٹر صاحب مرحوم کی سوانحعمری تیار کرنے کا ارادہ کریں ممکن ہے کہ اس وقت یہ اوراق کچھ مفید معلومات کا باعث ہوں، ان اوراق کو قلمبند کرنے میں رسالہ ندیم بہار نمبر گیا، رسالہ دوام ملاحظہ نین آباد اور ہفتہ وار اخبار عزائم لکھنؤ سے بھی طرح طرح مدد ملی ہے، ان کے علاوہ خود ڈاکٹر صاحب کی زبانی ان کی کہانی سنائی گئی ہے،

ان اوراق کو قلمبند کرتے وقت کہیں کہیں تسامحات ہو گئے ہیں مثلاً صفحہ ۱۳۱ پر مصطفیٰ رشید شروانی صاحب کو جناب تصدق احمد شروانی مرحوم کا صاحبزادہ بتایا گیا ہے لیکن وہ جناب تصدق احمد شروانی مرحوم صاحب کے صاحبزادہ نہیں بلکہ بھتیجے ہیں، انکے والد بزرگوار جناب نثار احمد شروانی مرحوم تھے جو یوپی کے وزیر بھی تھے، اسی طرح ص ۲۹ پر ڈاکٹر صاحب مرحوم کی بیگم صاحبہ کو جناب مظہر الحق صاحب بیرسٹر مرحوم کی بیٹی بتایا گیا ہے لیکن وہ بیٹی نہیں ہیں بھانجی ہیں مگر مظہر الحق صاحب نے ان کی اپنی بیٹی ہی کی طرح پرورش کی تھی کتابت کی بھی کچھ غلطیاں ہیں مثلاً صفحہ ۲۰ پر کیمبرج کے بجائے کیمرج ص پر ڈاکٹر ولیم مینل کے بجائے مسٹر انٹینل ص ۷۰ پر صوبہ کے سفیر کے بجائے ملک کے سفیر ہونے چاہئیں کتاب کی اور غلطیوں کی ناظرین اپنے ذوق کے مطابق تصحیح کر لیں

آخر میں ناظرین سے استدعا ہے کہ جب کبھی بھی ڈاکٹر صاحب مرحوم ان کو یاد آئیں تو ان کی روح کے ایصال ثواب کیلئے ضرور دعا کریں انکے اخلاق کی پاکیزگی، انکی طبیعت کی شرافت، انکے کردار کی بلندی، وطن سے انکی مخلصانہ محبت اور اسلام سے ان کے والہانہ لگاؤ کا تقاضا یہ ہے کہ ان کی مغفرت کے لئے دعائیں تہ دل سے نکلتی رہیں،

۹ مارچ ۱۹۷۲ء احقر: سید صباح الدین عبدالرحمٰن

(دارالمصنفین اعظم گڈھ)

تا سحر وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

ڈاکٹر سیّد محمودؔ

جناب ڈاکٹر سید محمود .... کو .... مرحوم .... لکھتے وقت قلم تھرتھرا رہا ہے، ہاتھ کانپ رہا ہے، دل رو رہا ہے، اُن کی وفات غیر متوقع نہیں ہوئی، انھوں نے کافی عمر پائی، ریڈیو اور اخباروں میں تو اُن کی عمر ۸۲ سال بتائی گئی ہے، مگر وہ غالباً اس سے بھی زیادہ عمر کے تھے، لمبی عمر پائی، مگر وہ خود بھی دنیا چھوڑنے کو تیار نہ تھے، اور نہ ہم لوگ ان سے اتنا جلد جدا ہونا چاہتے تھے، وہ مئی کے آخر میں اپنے ڈرائنگ روم میں اپنی پوتی سے پیار محبت کی باتیں کر رہے تھے، کہ اٹھنے اٹھنے میں پوتی سے ٹکرا کر قالین پر گر پڑے تو اُن کے پاؤں کی ہڈی ٹوٹ گئی، اسپتال لے جائے گئے، لیکن یہی موت کا بہانہ بن گیا، ٹوٹی ہوئی ہڈی علاج سے تو درست ہو گئی۔ مگر اور دوسرے امراض پیدا ہوتے گئے، پیشاب بند ہو گیا، آپریشن ہوا، ربر کی نلکی سے پیشاب جاری کیا گیا، بیہوش رہنے لگے، نلکی کے ذریعہ غذا پہنچائی جانے لگی، ہوش آجاتا، تو پہلے کی طرح باتیں کرنے لگتے، صحت کی امید بندھنے لگتی، اُن کے تمام اعزہ واقربا، اُن کی عیادت کو جمع ہو گئے، اُن کی ایک صاحبزادی پاکستان میں ہیں، وہ آگئیں، اُن کے ایک صاحبزادے سعید احمد جرمنی میں ہیں، وہ بھی آگئے، وہ دارالمصنفین کے بہت بڑے سرپرست اور مربّی رہے،

اور شاہ صاحب گذشتہ ۵۰ سال سے اُن کے تعلقات اس ادارہ سے تھے، اس لئے میں دونوں ۲۱ر جولائی کو اُن کی عیادت کے لئے دہلی پہونچے، وہاں تین روز قیام رہا، لیکن وہ ہوش میں نہیں آئے، اُن سے کوئی بات نہ ہو سکی اور نہ ان کو معلوم ہو سکا کہ ہم لوگ اُن کی محبت وشفقت کا حق ادا کرنے آئے ہیں، تین روز کے بعد ہم لوگ بڑی افسردگی کے ساتھ ان کے اعزہ سے رخصت ہو کر واپس ہو گئے، خطوط کے ذریعہ اُن کی حالت معلوم ہوتی رہی، کبھی امید زیست ہو جاتی، لیکن ۲۸ر ستمبر کی صبح کے ریڈیو سے یکایک خبر ملی، کہ وہ اللہ کو پیارے ہو گئے، آنکھیں اشک بار ہوئیں، دل رویا، رواں رواں رویا، رونے کے اسباب تھے، ادھر گذشتہ دس بارہ سال سے انھوں نے دارالمصنفین کو اپنی توجہ اور محبت کا خاص مرکز بنایا تھا، اور بیڑا اٹھایا تھا کہ وہ اپنی وفات سے پہلے دارالمصنفین کے سرمایہ محفوظہ کے لئے کئی لاکھ روپیہ اپنی مساعی جمیلہ سے جمع کر کے رہیں گے، اسی کوشش کے سلسلہ میں سعودی عرب کے سفیر کے ذریعہ سے پچاس ہزار روپیہ دارالمصنفین کو دلوائے، پھر اسی اکتوبر میں مجھ کو اپنے ساتھ لیکر کویت تشریف لے جانے والے تھے، اس سفر کے لئے تیاری بھی شروع کر دی تھی، لیکن خداوند تعالیٰ کو یہی منظور تھا کہ وہ دنیاوی سفر کرنے کے بجائے سفر آخرت کریں۔ انھوں نے یہ بھی خواہش ظاہر کی تھی کہ اب وہ دہلی چھوڑ کر دارالمصنفین چلے آئیں گے، جہاں رہکر وہ اپنے علمی کاموں کی تکمیل کریں گے، لیکن یہ ارمان انکے دل ہی دل میں رہ گیا اور وہ سپرد خاک ہو گئے، ان کی وفات سے دارالمصنفین والوں کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کا ایک بڑا سہارا ہی نہیں اٹھ گیا، بلکہ بے سہارا ہو گیا۔ جنازے میں ہم لوگوں کی شرکت ممکن نہ تھی، ریڈیو سے خبر ملی کہ شاہ ولی اللہؒ کے خاندان کے قبرستان میں سپرد خاک کئے گئے، جنازے میں کافی لوگ تھے، وزرا بھی، سفرا بھی، صدر جمہوریہ ہند کی بھی

نمایندگی تھی، وزیر اعظم اندرا گاندھی روس میں تھیں لیکن وہیں سے ان کا پیام تعزیت شائع ہوا، وہ سیاست سے کنارہ کش ہو چکے تھے، آنکھوں کی بینائی بھی کم ہوگئی تھی، بہت اونچا سنتے تھے، فیل پا کی وجہ سے زیادہ دور تک پیدل نہیں چل سکتے تھے، لیکن سفر اور کام کرنے میں جوانوں کو مات کرتے، سفر میں گرمی، سردی، دن، اور رات کا مطلق خیال نہ کرتے ایک صوبہ سے دوسرے صوبہ کا سفر بے تکلف کر لیتے، مسز اندرا گاندھی سے اپنی بیٹی ہی کی طرح محبت کرتے، گذشتہ انتخاب میں اُن کی خاطر اپنی آخری علالت سے گویا تین مہینے پہلے یو۔پی اور بہار کا سفر ایک طوفانی پروگرام کے ساتھ کیا، دہلی سے لکھنو، رائے بریلی، فیض آباد، جونپور، غازی پور، پٹنہ، مظفرپور، چھپرہ کا دورہ چند روز میں ختم کر لیا، اُن کے ساتھی تو تھک کر اُن کو چھوڑتے گئے، لیکن وہ تازہ دم دہلی واپس ہوئے، پھر فوراً اپنے نجی کاموں کے لئے دیوریا، غازی پور، اعظم گڈھ اور جونپور آئے، یہاں سے واپس ہوئے، تو جیسا کہ ذکر آیا ڈرائنگ روم میں اتفاقاً گر پڑے، اور گرے تو پھر نہ اُٹھے، وہ تقریباً پانچ مہینے ولنگڈن اسپتال میں رہے اتنی طویل علالت میں لوگوں نے اُن کو نظر انداز نہیں کیا، اُن کی عیادت کے لئے صدر وی۔وی۔گری۔ وزیر اعظم اندرا گاندھی، اور شہر کے اکابر، علماء، اور صلحاء برابر آتے رہے، سعودی عرب کے سفیر اُن کی عیادت کے لئے آئے، تو اُن کے اعزہ سے فرمایا کہ دنیا میں اگر کوئی بیش قیمت دوا ایسی ملتی ہو جس سے اُن کی صحت ہو جائے، تو وہ منگوالی جائے، اس کے اخراجات وہ برداشت کر لیں گے، لیکن کارکنانِ قضا و قدر کی طرف سے پیامِ اجل چل چکا تھا، اس لئے کوئی تدبیر کارگر نہ ہو سکی، اور وہ اپنے عزیزوں اور عقیدت مندوں کو اپنا غم منانے اور اپنی خوبیاں یاد کرنے کیلئے چھوڑ گئے،

اس مضمون میں ان کی سوانح عمری یا ان کے سیاسی حالات لکھنے کا ارادہ نہیں ہے،

وہ مجھ سے برابر کہتے رہے، کہ جب وہ دہلی چھوڑ کر دارالمصنفین میں قیام کریں گے تو مجھ کو اپنی سوانح عمری

اد ٹوبیاگرافی کے انداز میں ڈکٹیٹ کرادیں گے لیکن یہ نہ ہو سکا، جس کا افسوس ہے، اُن

کے ذاتی تجربات، مشاہدات اور خیالات قلم بند ہو جاتے، تو اُن کے دور کی سیاسی اور

ملی زندگی کی بہت ہی قیمتی دستاویز ہو جاتی، راقم زیادہ تر ان مضمونوں میں اپنے تاثرات کا اظہار کریگا،

گذشتہ بارہ تیرہ سال سے وہ مجھ سے بڑی محبت کرنے لگے تھے، دارالمصنفین آتے تو بارہ

ایک بجے رات تک اپنے پاس بٹھائے رکھتے، اور ہر قسم کی باتیں کرتے رہتے، کبھی اپنے خاندانی حالات

کا ذکر کرتے، کبھی اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے، کبھی اپنے معاصروں کا

ذکر چھیڑ دیتے، کبھی ہندوستان کے گذشتہ سیاسی واقعات پر تبصرہ کرنے لگتے، کبھی اپنی

خاص خاص تحریروں کے حوالے دیتے، کبھی جن جن تحریروں میں ان کا ذکر آیا ہے، اُن کی

نشاندہی کرتے، ان ہی تمام باتوں کی روشنی میں یہ سطریں لکھی جارہی ہیں،

ان کی ولادت غازی پور کے ایک مردم خیز گاؤں سید پور بھتری میں ہوئی، ان کے

خاندان میں دولت کے ساتھ علم اور مذہب بھی برابر رہا، مشائخ بھی گذرے، اکبر بہادر اور

بنگال کی فتح کے لئے آگرہ سے چلا تو سید پور بھتری سے گذرا، اُس وقت اس خاندان

میں دو مشہور بزرگ بندگی شاہ جمال اور بندگی شاہ محمود تھے، اکبر نے اُن سے ملنے کی

خواہش ظاہر کی، تو انھوں نے ملنے سے انکار کیا، مگر چند عدد بیریں بھیج دیں، اکبر اس تحفہ

کو فال نیک سمجھا، وہ واپسی میں پھر سید پور بھتری سے گذرا، تو اس خاندان کے لئے

ایک جائداد وقف کی، جو رفتہ رفتہ بڑھتی گئی، ڈاکٹر صاحب کے دادا جناب قاضی

فرزند علی نے اپنی وفات کے وقت ڈھائی لاکھ سالانہ آمدنی کی جائداد چھوڑی تھی،

وہ رئیس ہونے کے ساتھ بڑے مذہبی بھی تھے، مکہ معظمہ حج کے لئے گئے تو وہاں سے حضرت علی رضی

کے پیراہن کھڑاؤں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا موئے مبارک اور ہرن کی سینگ خط کوفی میں لکھا ہوا کلام پاک کا ایک نسخہ ساتھ لائے، ان تبرکات کی نمایش گاؤں میں برابر ہوتی رہی، مولانا شاہ وارث حسین ڈاکٹر صاحب کے بڑے بھائی کے استاد تھے، ایک بار وہ اس گاؤں میں آئے، تو ان تبرکات کو دیکھا تو ان پر جذب کا عالم طاری ہو گیا، ایک چیخ مار کر بولے واللہ یہی چیز ہے، یہی چیز ہے، حفاظت کرو، حفاظت کرو، اسی کے بعد انھوں نے بیعت وارادت کا سلسلہ شروع کیا، ڈاکٹر صاحب کے دادا حضرت سید احمد شہید بریلوی کی تحریک سے بھی متاثر تھے، انھوں نے اپنے ایک لڑکے یعنی ڈاکٹر صاحب کے بڑے چچا کو جہاد کے لئے حضرت سید احمد شہیدؒ کے سپرد کر دیا، ایک موقع پر انھوں نے اُن کی خدمت میں ایک لاکھ کی رقم بھی پیش کی، حضرت سید احمد شہیدؒ کو بھی اُن سے بڑی محبت تھی، جب وہ حج سے واپس ہوئے، تو غازی پور کے ایک گاؤں میں پہونچے، یہاں پہونچتے ہی فرمایا "بوئے دوست می آید، بوئے دوست می آید" یہ کہکر یوسف پور کی طرف پاپیادہ چل کھڑے ہوئے، جہاں اُس وقت ڈاکٹر صاحب کے دادا علیل تھے، اس علالت کے باوجود انھوں نے حضرت سید احمد شہیدؒ کا خیر مقدم بڑے جوش و خروش سے کیا، ان کو غازی پور لے گئے، اُن کے پورے قافلے کی خاطر و مدارات میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، بہت سے تحفے تحائف ساتھ کئے، اس سے متاثر ہو کر سید صاحب نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا، تم نے میرے دوست کو دیکھا،

ڈاکٹر صاحب کے والد ماجد ملا سید محمد عمر صاحب نے خالص دینی تعلیم پائی تھی، اسی لئے ان کے نام کا جز ملا ہو گیا تھا، وہ مولانا عبد العلیم آسی غازی پوری کے تلامذہ میں تھے، راہ سلوک پر بھی گامزن ہوئے، اور حضرت قطب الہند شاہ غلام معین الدین عرف شاہ امید علی

سجادہ نشین خانقاہ رشیدیہ جونپور سے بیعت کی، ڈاکٹر صاحب کو اپنے والد بزرگوار سے مذہبی
حمیت اور ایمانی غیرت وراثت میں ملی، صوم وصلوٰۃ کے پابند رہے، آخر زمانہ میں تو اوراد و وظائف
کا بھی شغل رکھنے لگے تھے، فیل پا کی وجہ سے اُن کو اٹھنے بیٹھنے میں تکلیف ہوتی تھی، مگر چوکڑی
مار کر بیٹھے بیٹھے نمازیں پڑھتے، سجدے کرنے میں ان کے پاؤں میں تکلیف ہوتی تھی، تکلیف
گوارا کر لیتے، دارالمصنفین آتے، یا میں خود اُن کے یہاں کبھی مہمان ہوتا، تو رات کو بھی اُٹھ کر
اُن کو نمازیں پڑھتے دیکھتا، اُن کے پاس دعاؤں کا ایک مجموعہ تھا جس میں قرآنی آیتیں بھی
اُن کو وہ روزانہ پڑھا کرتے، کچھ تو اُن کو زبانی یاد تھیں، اور کچھ دیکھ کر پڑھتے، ایک روز فرمانے
لگے، کہ ان دعاؤں کو پڑھتے وقت خیال آیا کہ معلوم نہیں صحیح بھی پڑھتا ہوں یا نہیں، بارگاہ
ایزدی تک پہونچتی بھی ہیں یا نہیں، ایک رات یاس و حسرت کے انہی جذبات کے ساتھ سو گیا،
تو خواب میں دیکھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں کھڑا ہوں، اور آپ فرما رہے
ہیں کہ جو دعائیں پڑھتے ہو اُن کو جاری رکھو، ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ آنکھیں کھلیں تو اپنے
کو پسینے میں شرابور پایا، انھوں نے کئی اور مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں
دیکھا، وہ ملک میں شیعہ سُنی کے فسادات سے بہت آزردہ خاطر رہتے، اسی آزردگی میں ایک
رات جو آنکھ لگی تو دیکھا کہ ایک مختصر مجمع ہے، فرش و فروش لگے ہوئے ہیں، حضور سرور دو عالم
تشریف فرما ہیں، حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی تشریف رکھتے ہیں، مجمع سے دو آدمی اُٹھے،
انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے حضرت علیؓ کی کچھ شکایت کرنے کی کوشش
کی، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارہ سے حضرت سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا وہاں
لائی گئیں، وہ ایک سفید چادر میں ملبوس تھیں، حضرت سیدہؓ کا ہاتھ حضرت علیؓ کے ہاتھ
میں دیا گیا، دونوں کا نکاح پڑھا یا گیا، لیکن یکایک دیکھنے میں آیا کہ لکڑی کا ایک بڑا سا

بکس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پشت پر رکھا ہوا تھا، اس میں کسی نے آگ لگا دی، اس میں سے چھوٹی چھوٹی پتلیاں نکل کر ناچنے اور آپس میں لڑنے لگیں، یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت ناگوار ہوا، وہاں سے آپ اٹھ کر دور جا کر تشریف فرما ہوئے،

ڈاکٹر صاحب نے اس خواب کا ذکر کر کے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دکھانا تھا کہ حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ سے آپ کا کیا تعلق ہے، پتلیوں کے جھگڑنے سے مراد شیعہ سنیوں کے باہمی جھگڑے ہیں، اور آپ کا وہاں سے اُٹھ جانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ مسلمانوں کے جھگڑے سے اسلام کی جو تضحیک و تذلیل ہو رہی ہے اس سے آپ کو سخت تکلیف ہو رہی ہے، اور آپ ناراض ہیں، اس خواب کا ذکر انھوں نے اس پمفلٹ میں بھی کیا ہے، جو انھوں نے شیعہ سُنّی کے اتحاد کے سلسلہ میں "سُنّی مسلمانوں سے ایک دردمندانہ اپیل" کے عنوان سے ہندوستان کے مشاہیر کے دستخطوں کیساتھ شائع کرایا تھا، لیکن اس میں اپنا نام ظاہر کرنا پسند نہیں کیا،

ان کو اپنی مذہبیت کی بنا پر کلام پاک سے بڑا شغف رہا، جب تک اُن کی بینائی کام کرتی رہی، اس کی تلاوت بھی کرتے رہے، اس کی تفسیر بھی پڑھتے، اس کے پڑھنے اور سمجھنے سے متعلق اُن کے جو خیالات تھے، اس کا اظہار دارالمصنفین کی مجلسوں میں برابر کرتے رہتے، کہتے کہ مسلمانوں نے قرآن پاک کو جزدان میں لپیٹ کر رکھ دیا ہے، وہ اسلام کو قرآن پاک کے ذریعہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے، بلکہ اپنے ماضی قریب کی روایات ہی کو اسلام سمجھتے ہیں، قرآن پاک کا تخاطب ساری انسانیت سے ہے لیکن ہم نے غیر حکیمانہ طور پر اس کو صرف مسلمانوں ہی کے لئے مخصوص سمجھ رکھا ہے، اسی لئے ہمارے علماء نے اللہ تعالیٰ کو ربّ المسلمین بنا دیا ہے، وہ ربّ العالمین بنا کر پیش کرنے میں ناکام رہے ہیں، نیفض آباد کے رسالہ دوام کے ایک انٹرویو میں یہ کہا کہ افسوس ہے کہ ہندوستان میں شیخ عبدہ اور شکیب ارسلان

جیسی شخصیتیں نہیں پیدا ہوئیں، جو قرآن پاک کی آیات کی روشن تعبیر کرتیں اور اس دور کے مسائل کی گرہیں کھولتیں، قرآن مجید کی آخری تفسیر و تشریح کبھی نہیں ہو سکتی، یہ بڑا معنی خیز، جامع العلوم اور عظیم المرتبت کلام ہے، ہر دور میں یہ سائنٹفک حقائق سے ہم آہنگ رہا ہے، ہر دور کے محقق اور سائنس داں نے اس کے اندر وہ صداقتیں دیکھی ہیں جو کائنات میں بکھری ہوئی ہیں، ضرورت ہے کہ ہم اس کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کی صلاحیت پیدا کریں"۔ اپنی وفات سے چار مہینہ پہلے اپنے ایک مضمون میں یہ تحریر فرمایا:-

"کلام پاک کو اس سائنٹفک دور میں سائنٹفک طور پر سمجھنے کی ضرورت ہے، ایک یوروپین سائنسداں نے لکھا ہے کہ قرآن کو سمجھنے کے لئے صرف عربی کا جاننا کافی نہیں، سائنس کے علوم کو بھی جاننا لازمی ہے، موجودہ دور کے سائنس دانوں نے یہ اعلان کیا ہے کہ اوپر کے سیاروں تک پہونچنے میں دور حاضرہ کی بجلی کام نہیں دے سکتی، اس لئے وہ اور طاقت ور بجلی کے انکشاف میں لگے ہوئے ہیں، اگر ہمارے رسول صلعم کی معراج جسمانی تسلیم کرلی جائے، تو کیا عجب ہے کہ اُن کا براق در اصل وہی برق ہو جس کے انکشاف کی کوشش آج کل کے سائنسدان کر رہے ہیں، اسی طرح کے اور بہت سے قرآنی اشارے ہیں، جو سائنس کے نہ جاننے کی وجہ سے سمجھ میں نہیں آتے، قرآن کے الفاظ سخّر الشمس والقمر کی تائید سائنس کے موجودہ انکشافات سے ہو رہی ہے، اسی لئے قرآن پاک کو سمجھنے کے لئے سائنس کے علوم کی واقفیت ناگزیر ہوگئی ہے، یاد آتا ہے کہ سر شاہ سلیمان نے اپنی سائنسی تحقیقات کے سلسلہ میں کہا تھا کہ سائنس کے انکشافات جتنے زیادہ ہوتے جائیں گے، اتنا ہی ذات باری کا یقین بڑھتا جائے گا" تک

خدا کے وجود کے متعلق شکوک اس لئے ہیں کہ ابھی سائنس کی تحقیقات مکمل نہیں ہو سکی ہیں،....... قرآن پاک میں ذوالقرنین کے متعلق جیسی باتیں لکھی ہوئی ہیں، وہ موجودہ تحقیقات سے صحیح ثابت ہو رہی ہیں، قرآن پاک کا یہ دعویٰ کہ اس کی تعلیم ہر زمانہ کے لئے ہے مزید تحقیقات سے اور بھی مستحکم ہو جائے گا،"

اُن کو اس کی بھی لگن رہی کہ قرآن پاک کی تعلیمات زیادہ سے زیادہ عام کیجائیں، حیدرآباد کے ڈاکٹر عبداللطیف نے جب مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمان القرآن کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کا ارادہ کیا، اور ایک سوسائٹی کی تشکیل کرکے قرآنی تعلیمات کو انگریزی زبان کے ذریعہ سے زیادہ سے زیادہ ترویج دینے کی اسکیم بنائی تو ڈاکٹر صاحب نے اپنی کوششوں سے ان کے لئے ایک گرانقدر رقم فراہم کرائی،

اُن کو اپنے خاندانی اثرات کی وجہ سے صوفیائے کرام سے بھی بڑی عقیدت رہی، کہا کرتے کہ مجھکو بچپن میں حضرت قطب الہند مولانا غلام معین الدین (عرف شاہ امید علی) کی گود میں کھیلنے کا فخر حاصل ہوا، جونپور جاتے تو ان کی خانقاہ میں ضرور حاضری دیتے، اس کی مالی امداد بھی کیا کرتے، ان کی خواہش یہی رہی کہ وہ اپنی وفات کے بعد جونپور ہی میں سپرد خاک ہوں، اس سلسلہ کے بزرگوں کے قبرستان میں اپنی جگہ بھی متعین کر دی تھی، مگر مشیت ایزدی کچھ اور تھی، ایک بار میں ان کے ساتھ جونپور میں تھا، تو اس قبرستان میں اُن کے ساتھ گیا، یہیں ان کے والد بزرگوار اور والدہ بھی مدفون ہیں، اپنے والدین کی قبروں کے علاوہ اور دوسرے بزرگوں کے مزاروں پر علحدہ علحدہ جا کر غایت عقیدت اور احترام سے فاتحہ پڑھتے رہے، دارالمصنفین آتے تو صوفیائے کرام کے واقعات شوق سے سنتے، اور خود بھی بیان کرتے، ایک روز میری کتاب بزم صوفیہ سے حضرت

نصیر الدین چراغ دہلوی کے حالات شروع سے آخر تک پڑھوا کر سنے، اور جب میں نے ختم کر کے

اُن کے چہرے کی طرف دیکھا تو اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے،

اُن کو اپنے والد بزرگوار کے استاد شاہ عبدالعلیم آسی سے بھی بڑی عقیدت رہی، کہتے تھے

اُن سے بیعت تو نہیں ہوا لیکن اُن کا صحبت یافتہ ہوں، مگر اپنی بعض تحریروں میں اُن کے نام

کے ساتھ پیر و مرشد بھی لکھا ہے، ان کے کلام کے مجموعہ کو سفر میں برابر ساتھ رکھتے، اس مجموعہ

کے بہت سے اشعار اُن کو زبانی یاد تھے، جو سنایا کرتے، پھر بھی تشفی نہ ہوتی، تو مجموعہ سے

اشعار پڑھوا کر سنتے، دارالمصنفین کے قیام کے زمانے میں ایک رات اپنی اٹیچی سے کلام آسی

نکال کر مجھ کو دیا، اور کہا کہ اس کو پڑھ کر سناؤ۔ میں نے یہ مجموعہ کھولا، تو یہ غزل پڑھنے لگا۔

کبھی میری بھی تجھے چاہ تھی، ترے دل میں میری بھی راہ تھی

کبھی اس طرف بھی نگاہ تھی کہ یہ سب خیال ہے خواب ہے

دلِ مبتلا ہے ترا ہی گھر اسے رہنے دے کہ خراب کر

کوئی میری طرح تجھے مگر نہ کہے کہ خانہ خراب ہے

یونہیں اپنے کوچہ میں رہنے دے نہ عبث اٹھا کے ستا مجھے

جو اٹھے تو درد جگر اٹھے، کہیں مجھ میں اٹھنے کی تاب ہے

اگر آنکھ کھولو تو کچھ نہیں اثر نہ جود بجز فنا،

ہے سوادِ ہستی بے بقا کہ بیاضِ چشم حباب ہے

ہر شعر پر وجد کرتے، کبھی تکیہ کے سہارے لیٹ جاتے، کبھی اٹھ بیٹھتے، ہر شعر کو

سمجھاتے بھی جاتے، کہتے کہ اشعار میں تغزل، موسیقی، جذبہ سب کچھ ہے، پھر کہا کہ اسی

قافیہ اور ردیف میں کیفِ عشق کے عنوان سے بھی اُن کے اشعار ہیں، وہ بھی پڑھو،

نہ کبھی کے بادہ پرست ہم نہ ہمیں یہ کیفِ شراب ہے

لب یار چومے تھے خواب میں وہی جوشِ مستیِ خواب ہے

وہی پیشِ چشم ہیں ہر نظر مگراب بھی شوقِ نقاب ہے

وہی میری ہر رگ و پے میں ہیں مگر اب بھی مجھ سے حجاب ہے

انھیں کبر حسن کی نخوتیں مجھے فیض عشق کی حیرتیں

نہ کلام ہے نہ پیام ہے نہ سوال ہے نہ جواب ہے

ان کو مولانا آسی کے مجموعۂ کلام کے تمام عنوانات یاد تھے، کبھی کبھی اس کے صفحے بھی بتا دیتے، کہتے کہ مولانا آسی کے بہت سے اشعار میں کسی نہ کسی آیت قرآنی یا حدیث کی طرف اشارہ ہے، پھر وحدت الوجود پر ان کے اشعار سناتے رہتے، اس شعر کو بار بار پڑھتے

بجز تمہارے کسی کا وجود ہو یہ محال مگر تمہیں نظر آتے ہو ما سوا ہو کر

مولانا آسی کے یہ اشعار بھی انہی کی زبان سے سُنے :-

بلندی اُس کی اسی کی پستی ہر ایک شے میں اسی کی ہستی

عروج اُسی کا رسول ہو کر، نزول اسی کا کتاب ہو کر

ان کی ابتدائی تعلیم جونپور میں ہوئی، پھر اپنے بہنوئی سید محمد عمر صاحب کے ساتھ بنارس چلے گئے، یہاں مولوی محمد عمر صاحب نے ان کے والد کی مرضی کے خلاف انگریزی تعلیم دلانی شروع کی، یہیں کے قیام کے زمانہ میں ان کو مولانا شبلی کی تصانیف سے دلچسپی ہوئی پھر یہ دلچسپی عقیدت میں ایسی تبدیل ہو گئی، کہ ان کے شاگردوں سے بھی گہرے تعلقات پیدا کئے، اور پھر دار المصنفین سے وابستہ ہوئے تو اس سے برابر کی محبت کا اظہار کرتے رہے، وہ مولانا شبلی کو بہت بڑا عالم، ادیب، مورخ، شاعر سمجھتے تھے، ان کی

بصیرتِ فکر اور نظر کے بہت قائل تھے، سیرۃ النبی اور الفاروق کی بہت تعریف کرتے، البتہ مضامین عالمگیر کی بعض باتوں سے اختلاف کرتے، کہتے کہ یہ بہت ہی اچھی کتاب ہے اورنگزیب کے خلاف جو زہر پھیلایا گیا ہے، اس کا یہ تریاق ہے، مگر مولانا نے اورنگزیب کو سراہنے میں کہیں کہیں شاہجہان اور جہانگیر وغیرہ کو جو مجروح کیا، وہ نہ کرتے، تو اچھا تھا،

مولانا شبلی کو بھی اُن سے لگاؤ رہا، دونوں میں برابر خط وکتابت رہی، مولانا شبلی اُن سے علمی خط وکتابت بھی کرتے، اپنے خط میں ان کو محبی لکھتے، اور جب آخر میں مجلسِ تالیف سیرت قائم کی تو ان کا نام بھی اس میں رکھنا چاہا، مولانا شبلی کا ایک خط ان کے نام سے یہ ہے،

محبی! سلام شوق!

آپ سے تو میں نے امیدوں کا بڑا سلسلہ قائم کیا تھا؛ جو بیچ میں ذرا منقطع ہوگیا تھا،

یہ سچ ہے کہ جرمن پر نظر ڈالنی چاہئے لیکن نظر کہاں سے آئے ہیں بالکل نیا ہوں، آپ جب باقی پورپ بھی تو مجھ کو لکھیں، میں دو ایک مہینہ کے بعد ضرور آجاؤں گا، مرگولیس، نولدکی وغیرہ سے بہت کچھ نقل کرتا ہے لیکن وہ سب مضحکہ انگیز ہوتے ہیں، آج جو مقام زیر قلم تھا، وہ یہ کہ نولدکی نے آنحضرتؐ کا ذلیل النسب ہونا ثابت کیا ہے، دلائل سخت حیرت انگیز ہیں، قرآن مجید میں ایک آیت ہے،

وقالوا لولا نزل ھذا القرآن علی رجل من القریتین عظیم — یعنی کفار کہتے ہیں کہ قرآن دو شہروں میں کسی رئیس پر کیوں اترا

عظیم کا لفظ رئیس اور صاحب دولت واقتدار کے لئے آتا ہے؛ اس کے صرف یہ معنی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دولت اور ریاست حاصل نہ تھی اس سے بدنسبی

کہاں ثابت ہوتی ہے، یہ تولید یک کا استدلال ہے،

میں نے بعض فرینچ کتابیں پڑھی ہیں، رینان کا ایک رسالہ سبقاً پڑھا ہے، عجیب حماقانہ باتیں پاتا ہوں رینان نے ثابت کیا ہے کہ علم اور اسلام جمع نہیں ہو سکتے، پورا رسالہ اسی بحث پر ہے

ذالک مبلغھم من العلم ..... مجھ کو تو اس حمام میں سب ننگے نظر آتے ہیں

آپ کا خط جی چاہتا ہے الہلال وغیرہ میں شائع کر دوں کل یا جزاً

یہ میں چاہتا ہوں کہ مجلس تالیف سیرت میں آپ کا نام شامل کروں"

شبلی - لکھنؤ،

۱۵ر اکتوبر ۱۹۱۲ء

۱۸۹۹ء میں وہ مزید تعلیم کے لئے اٹاوہ بھیجے گئے جہاں مولوی بشیر الدین صاحب نے اپنا مشہور اسکول کھول رکھا تھا، انھوں نے کئی بار اثنائے گفتگو میں بیان کیا کہ جب انھوں نے پہلی دفعہ مولوی بشیر الدین کو دیکھا تو ان کو مسلمانوں کا اتنا بڑا محسن سمجھنے کے بجائے اسکول کا کوئی ادنی ملازم سمجھا، وہ اپنے لباس اور وضع قطع سے بے نیاز رہتے، خود سادہ رہ کر مسلمان طلبہ کو سادگی اور کفایت شعاری کی تلقین کرتے رہے، ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی بتایا کہ جب وہ پہلی دفعہ ان سے ملے تو وہ دوڑ کر ایک ٹوکری میں چنے لائے، اور کہا کہ یہ ناشتہ تمھیں کرنا ہوگا، اٹاوہ میں وہ تین مہینے سے زیادہ نہ رہے، وہاں سے علی گڈھ چلے گئے، مگر مولوی بشیر الدین سے بہت متاثر رہے اکثر کہتے کہ ان کے اخبار البشیر کی حیثیت اس زمانہ میں ٹائمس آف لندن کی تھی، وہ انگریزوں اور خصوصاً یو۔پی کے گورنر کے خلاف برابر مضامین لکھا کرتے، اُن کے اخبار میں کوئی اور صاحب ہندوؤں کے خلاف بھی مضامین لکھتے تھے، ڈاکٹر صاحب کو اپنی

اس کم سنی میں بھی ان مضامین سے دُکھ ہوا تھا، مولوی بشیر الدین کے یہاں روزانہ شام کو "جہل مرکب" کے نام سے ایک اجتماع ہوا کرتا تھا جس میں ہر قسم کے مسائل پر گفتگو ہوتی تھی ڈاکٹر صاحب بھی اس اجتماع میں شریک ہونے لگے، انھوں نے اس میں ان مضامین پر سخت نکتہ چینی کی، ان کا خیال تھا کہ قومی تحریک کے لئے ایسے مضامین مضر ہوں گے اس ملک میں رہ کر ہندؤں کو اپنے سے دور کرنے کے بجائے اُن کو اپنے سے قریب تر کرنا ضروری ہے، اگر ہندوؤں کو مسلمانوں کی طرف سے شکوک ہیں، تو اُن کو دور کر کے ان کو اپنی طرف مائل کرتے رہنا چاہئے، ڈاکٹر صاحب کا بیان ہے کہ انھوں نے اس سلسلہ میں اور بھی جو دلائل پیش کئے، ان سے مولوی بشیر الدین صاحب خوش ہوئے، اور وہ روزانہ اپنے ساتھ ان کو ٹہلنے کے لئے جاتے، ڈاکٹر صاحب نے اس موقع پر جو کچھ کہا تھا وہی اُن کے ذہن کا خمیر بنا رہا، وہ ۱۹۰۸ء میں مزید تعلیم کیلئے علی گڑھ گئے جہاں ۱۹۰۸ء سے ۱۹۰۹ء تک رہے، اس مادرِ درسگاہ کی محبت ان کے دل میں ایسی سرایت کیے ہوئی تھی، کہ آخر وقت تک اس کے خلاف کوئی بات سننا پسند نہ کرتے، سر سید سے تو اُن کو ملنے کا اتفاق نہیں ہوا، لیکن وہ اُن کو مسلمانوں کا بہت بڑا محسن سمجھتے، ان کے متعلق ان کے جو خیالات رہے، وہ ان کی اس تحریر کے ٹکڑے سے ظاہر ہونگے جو انھوں نے اپنی وفات سے پانچ مہینے پہلی لکھی، وہ لکھتے ہیں:-

"سر سید سند یافتہ عالم تو نہ تھے لیکن اُن کے جو کارنامے ہیں، ان کی وجہ سے کینٹول اسمتھ نے اُن کو حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ کی صف میں لا کھڑا کیا ہے، شبلی، حالی، نذیر احمد اور آزاد کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی تحریروں سے مسلمانوں کو نشاۃ الثانیہ عطا کی لیکن اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اردو کے یہ عناصر اربعہ سر سید کے خیالات و تحریکات سے متاثر نہیں ہوئے، شبلی کا سلسلۂ ناموران اسلام

سرسید ہی کی صحبت کی وجہ سے شروع ہوا، ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں اور لکچروں میں سرسید کے خیالات کی پوری عکاسی ہے اور آج یہ بحث جاری ہے کہ اُن کے ناول ابن الوقت کا ہیرو دراصل سرسید ہی کا کیرکیٹر ہے، ابن الوقت انگریزوں کے تمدن میں ضرور رنگ گیا ہے، لیکن اس کی خودداری اور غیرت کی جو تصویر کشی کی گئی ہے وہ ضرور قابلِ قدر ہے، حالی نے گلِ گشتِ رندانہ اور نغمۂ مستانہ الاپنے کے بعد جب سرسید کو اپنا رہبر تسلیم کرلیا، تو پھر ان کا ملی درد، مذہبی جوش اور ایمانی ولولہ مسدس حالی کی شکل میں ظاہر ہوا، اور یہ وہ کتاب ہے، جس نے مسلمانوں میں غیرمعمولی معاشرتی، تعلیمی، دینی اور مذہبی انقلاب پیدا کیا، اس کے مفید اثرات اس وقت تک باقی رہیں گے، جب تک مسلمان ہندوستان میں اردو پڑھتے رہیں گے یہ مسدس دراصل سرسید ہی کے جذبات کی صحیح تصویر ہے اور یہ ان ہی کا کارنامہ ہے، ہندوستان کی گذشتہ تین صدیوں کے اندر مسدس حالی جیسی کوئی اور کتاب گذشتہ تین صدیوں کے اندر ....

.... نہیں لکھی گئی جس سے مسلمان اتنا زیادہ متاثر ہوئے ہوں، اور انھیں ہر شعبۂ زندگی میں اتنے فوائد پہونچے ہوں، خود مولانا ابوالکلام آزاد سرسید کے کارناموں سے متاثر رہے، یہ اور بات ہے کہ اُن کے سیاسی خیالات سے متفق نہ تھے، میں تو اقبال کو بھی سرسید ہی کی تحریکات کا علم بردار سمجھتا ہوں، سرسید کے مذہبی خیالات سے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ انھوں نے اس سائنٹفک اور اٹیمک دور سے پہلے کلام پاک کو سائنٹفک طریقہ سے سمجھنے کی کوشش کی بنیاد ڈالی لیکن اُن پر کفر کے اتنے فتوے صادر ہوئے کہ اپنے کالج

کے مفاد کی خاطر اس کوشش کو بہت زیادہ بار آور نہ کر سکے، وہ کافر تو ضرور بنائے گئے، لیکن انھی کے یہ اشعار بھی ہیں،

خدا دارم دلِ بریاں زعشقِ مصطفیٰؐ دارم
ندارد ہیچ کافر سازوسامانے کہ من دارم
زجبریلِ امیں قرآں بہ پیغامے نمی خواہم
ہمہ گفتارِ معشوق است قرآنے کہ من دارم

اپنے سینے میں اسلام کی آتش فروزاں رکھنے والا ہی یہ اشعار کہہ سکتا ہے،"

ان کی وطنی محبت کا جذبہ علی گڈھ میں اتنا اُبھرا کہ وہ وہاں قوم کے نام سے یاد کئے جانے لگے، اپنی ایک تحریر میں اپنے زمانہ کے کالج کے ساتھیوں کو یاد کرکے لکھتے ہیں:-

"مہندر پرتاب، تصدق احمد، حیات، جواہر لال (جواہر لال نہرو نہیں) مجید احمد، شیو پرشاد، باقی، محسن، شمشاد، مسعود، یہ سب طلبہ علی گڈھ کے مشہور کالج میں انٹرنس میں تعلیم پاتے تھے، یہ ہندوستان کے مختلف صوبوں کے رہنے والے تھے، لیکن ایک دوسرے کے ہمدرد، غمخوار اور آپس میں سب دوست تھے، روزانہ شام کو ماریسن کورٹ (جہاں ان میں سے اکثر رہتے تھے) کے کمرہ نمبر ۴ میں جمع ہوتے تھے، اور دیر تک ہنستے بولتے اور آپس میں گپ شپ کرتے رہتے، مہندر پرتاب، جواہر، شیو پرشاد ایک علٰحدہ بنگلہ میں رہتے تھے، جو بورڈنگ ہاؤس میں خاص کر ہندو طلبہ کے لئے متعین کردیا گیا تھا، شام کو یہ سب دوست مل کر کبھی کبھی پرانے قلعہ کی طرف سیر و تفریح کے لئے چلے جاتے، اونچے درجے کے طلبہ میں بھی (مثلاً عبدالرحمٰن (بجنوری) عزیز الرحمٰن، اور بدرالدین) ان کے

کچھ دوست تھے، عبدالرحمن ایم۔اے میں پڑھتے تھے، اور عزیزالرحمن اور بدرالدین ایف اے میں، کبھی کبھی یہ دونوں بھی اپنے دیگر دوستوں کے ساتھ مل کر مختلف مضامین پر گفتگو کیا کرتے تھے، مہندر پرتاب اپنے درجہ میں محنتی لڑکوں میں شمار ہوتے تھے، لیکن ان کو تاریخ نہیں یاد ہوتی تھی، اور نہ دل اپنا اس مضمون میں لگاتے تھے، جواہر اور احمد کو اپنے درجہ میں تاریخ سب سے اچھی یاد تھی، حیات اور شیو پرشاد کو ہندو اور مسلمانوں کے زمانہ کی تاریخ سے دلچسپی تھی، لیکن انگریزوں کے زمانہ کی تاریخ کو وہ شوق سے یاد کرتے تھے، تمام وائسرائن کے شاندار نام ان دونوں کو ازبر یاد تھے، ہمارے میر ولایت حسین صاحب جن کا انتقال ۱۸ر جولائی ۱۹۳۹ء کو ہوگیا، تاریخ کے استاد تھے، ہر چند کوشش کرتے کہ مہندر پرتاب کو کسی طرح تاریخ یاد ہوجائے، تاکہ وہ امتحان میں کامیاب ہوجائیں، لیکن ان کی ساری کوششیں رائگاں جاتیں"

مہندر پرتاب سے مراد راجہ مہندر پرتاب ہیں، جو ابھی تک زندہ ہیں، اور انقلابی ہونے کی وجہ انگریزوں کی حکومت کے زمانے میں بہت دنوں تک جلاوطن رہے، تصدق سے مراد تصدق احمد شروانی ہیں، جو اپنے زمانہ کے مشہور کانگریسی لیڈر اور نثار احمد شروانی کے بھائی تھے، عبدالرحمن سے مراد ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری ہیں، جو غالب پر اپنے ایک مضمون کی وجہ سے اردو ادب میں ایک مستقل جگہ بنا گئے ہیں، مجید سے مراد عبدالمجید خواجہ ہیں، جو بیرسٹر ہو کر کانگریسی لیڈر اور جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر بھی ہوئے، حیات بعد میں لارڈ حیات کے نام سے مشہور ہوئے، وہ نواب بھوپال کے پرائیوٹ سکریٹری بنے، عزیزالرحمن جمعیۃ العلماء کے مشہور رہنما مولانا حفظ الرحمن کے بڑے بھائی تھے، بدرالدین انا ؤ کے

رہنے والے تھے، کمیونسٹ خیالات رکھتے تھے، انھوں نے چھ جلدوں میں "میرا پہلا گناہ" کے نام سے ایک کتاب لکھی، اُن کا بعد میں قتل ہو گیا۔

ان کے ہم جماعت سرسید کے پوتے سر راس مسعود اور قاضی تلمذ حسین مصنف "مراۃ المثنوی" بھی تھے، سر راس مسعود کو سیاست سے کوئی غیر معمولی دلچسپی نہیں رہی، اس کے باوجود دونوں کے تعلقات برابر خوشگوار رہے، البتہ قاضی تلمذ حسین اُن کی سیاسی سرگرمیوں کے ناقد رہے، اُن کے خلاف کچھ مضامین بھی لکھے۔

علی گڈھ میں رفتہ رفتہ اُن کے ساتھیوں کا ایک ایسا گروپ بن گیا، جو ہندوستان میں برطانوی حکومت کے خلاف رہا، اس گروپ نے طلبہ پر انگریزوں کی جو مرعوبیت چھائی ہوئی تھی، اس کو وطنی محبت کے جذبے میں دور کر کے ہندو مسلمان کو ایک دوسرے سے قریب تر کرنے کی کوشش کی، ان کے ہم خیال طلبہ نے ایک خفیہ سوسائٹی اخوان الصفا کے نام سے قائم کی، اس میں جو بحث مباحثے ہوتے، اس کا اندازہ ان کی کتاب "آج سے قبل کا ہندوستان" سے ہو گا، اس میں انھوں نے اپنے زمانہ کے علی گڈھ کے طلبہ کی گفتگو وں کے حوالے سے اُن کی ذہنیت کو بھی پیش کیا ہے، اس کتاب کا ذکر آگے آئے گا۔

اس زمانہ میں ام۔ او۔ کالج میں انگریز اساتذہ میں مارسین، کازنا، اور براؤن تھے، اُن کے خلاف طلبہ میں بے چینی پیدا ہوئی، تو انھوں نے اور مطالبات کے ساتھ یہ بھی مطالبہ کیا، کہ بورڈنگ ہاؤس اور ڈائننگ ہال انگریز اساتذہ کے سپرد نہ کئے جائیں، اور اگر وہ اساتذہ کی حیثیت سے نااہل ثابت ہوں تو دو رعایت کے بغیر برطرف کر دیئے جائیں، یہ بے چینی ۱۹۰۷ء میں ایک اسٹرائیک میں منتقل ہو گئی، ڈاکٹر سید محمود نے اس میں نمایاں حصہ لیا، وہ اور طلبہ کے ساتھ کالج سے نکالے گئے، مگر اس سے اسٹرائک کرنے والوں کی اور بھی زیادہ

بے چینی بڑھی، حکیم اجمل خاں بیچ میں پڑے، اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب چند طلبہ کے ساتھ اردو ادب کے مشہور مصنف ڈپٹی نذیر احمد سے بھی جا کر ملے، ڈپٹی نذیر احمد اپنے خاص انداز میں گفتگو کرنے کے عادی تھے، انھوں نے طلبہ سے ہمدردی کا اظہار تو ضرور کیا، مگر اور باتوں کے ساتھ یہ دلچسپ باتیں بھی کہیں،

"تم جانتے نہیں انگریز کتے کی ذات ہے، جہاں ایک کتے نے پیشاب کیا، پیشاب لگے یا نہیں، ہر کتا وہاں آکر ضرور پیشاب کرے گا،

"بد معاشو، سودیشی سوجھی ہے، سودیشی سوت کہاں سے آئے گا، کیا تمھاری خالائیں سوت کاتیں گی، انگریز کا مقابلہ کرنے چلے ہو"

اسٹرائک ختم ہوئی تو ڈاکٹر صاحب پھر کالج میں داخل کر لئے گئے، اور اس کے یونین پر انہی کا قبضہ رہا جس سے انگریز اساتذہ ان سے بدظن رہے،

وہ اپنے کالج کے ساتھیوں میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، تصدق احمد شروانی اور خواجہ عبدالمجید سے زیادہ متاثر تھے کئی بار مجھ سے کہا کہ فرصت ہوگی تو دارالمصنفین میں آکر ان دوستوں پر ایک مستقل کتاب لکھواؤں گا، میں بولتا جاؤں گا تم لکھتے جانا" ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی علمی اور ادبی صلاحیت کے بہت معترف رہے، اپنے ایک مضمون میں اُن کے متعلق لکھتے ہیں،

"اس نئے دور میں مغربی تعلیم نے ہندوستان میں ایک ایسا نوجوان پیدا کیا تھا جس نے مرزا غالب کی عظمت حقیقی معنوں میں پہچان لی تھی، اور جو کلام غالب کو ایسے حسن معانی کیساتھ ملک کے سامنے پیش کرنے والا تھا جس سے فلسفی، صوفی، شاعر اور سائنس داں سب ہی متحیر رہ جاتے آہ عبدالرحمٰن، عمر نے تیرے ساتھ وفا نہ کی، تو ملک و قوم کی عظیم الشان خدمت انجام نہ دیسکا"

میرا خیال ہے کہ ان ہی کی صحبت میں ڈاکٹر صاحب کو غالب سے دلچسپی پیدا ہوئی، ان کو غالب

کے بکثرت اشعار یاد تھے، اور اپنے بڑھاپے میں بھی اُن کا کلام سناتے تو سناتے ہی چلے جاتے، سنہ ۱۹۲۰ء میں غالب پر انھوں نے ایک مضمون لکھ کر اُن کے اشعار سے سیاسی نتایج نکالے جس سے ایک خاص قسم کی دلچسپی پیدا ہو گئی، اس کا ذکر آگے آئیگا، تصدق احمد شروانی کے صاحبزادہ جناب مصطفے ارشید شروانی ہیں جو الہ آباد جیپ کمپنی کے مالک ہیں اُن سے ڈاکٹر صاحب کے بہت ہی عزیزانہ تعلقات رہے، خواجہ عبد المجید صاحب کے گھر والوں سے بھی آخر وقت تک اُن کا گہرا لگاؤ رہا،

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب جب مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے تو ان سے پہلے ڈاکٹر صاحب کا نام بھی وائس چانسلری کے لیے اخباروں میں آیا، اسی زمانہ میں جب وہ علی گڈھ گئے، تو طلبہ ان کو ایک بہت ہی شاندار جلوس میں اسٹیشن سے یونیورسٹی لے گئے، انھوں نے اس موقع پر علی گڈھ سے اپنی محبت کا پورا اظہار کیا لیکن وائس چانسلری کا عہدہ قبول کرنے سے انکار کیا،

وہ علی گڈھ کے کسی اولڈ بوائے کی تعریف سنتے تو ان پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی، ایک بار دار المصنفین میں ان کا قیام تھا، رات زیادہ گذر چکی تھی، میں اُن کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا تھا اثنائے گفتگو میں منشی ذکاء اللہ کے لائق فرزند جناب عنایت اللہ صاحب بی اے علیگ سابق ناظم دار الترجمہ حیدر آباد کا ذکر آیا، میں اُنکے ساتھ دہرہ دون میں کچھ دنوں رہ چکا تھا اُن کی شرافت، اخلاق، وضعداری، نیت، مروت اور محبت کے کچھ واقعات سنائے، تو وہ سن کر بہت ہی خوش اور شگفتہ ہو گئے، جھومنے اور کہتے اُن کے کچھ اور واقعات سناؤ، بستر سے اُٹھ کر بیٹھ جاتے اور کہتے کہ ان واقعات کو سنا کر تم نے میری آج کی رات کو کیسی خوشگوار بنا دی ہے، پھر یکایک دیکھا کہ اُن کے دونوں ہاتھ دعا کے لئے اُٹھ گئے، اور وہ کچھ پڑھ رہے ہیں، جب پڑھ چکے تو کہا میں عنایت اللہ صاحب پر فاتحہ پڑھ رہا تھا، اور اللہ تعالیٰ سے اُن کی مغفرت کے لئے دعائیں مانگی ہیں،

ان کی وفات کے بعد ان پر اخباروں میں اب تک مضامین آرہے ہیں، ۹ راکتوبر ۱۹۶۸ء کے مدینہ بجنور

میں ان پر ایک مضمون "ڈاکٹر سید محمود کی کچھ یادیں" کے عنوان سے شائع ہوا ہے، اس میں ہے:

"مسلم یونیورسٹی سے انھیں عشق تھا، اور ہر وقت وہ اس غم میں گھلا کرتے تھے، کہ تعلیم گاہ کسی طرح سرکار کی دست برد سے بچے، جس زمانے میں مسٹر چھاگلا وزیر تعلیم تھے، انھوں نے لوک سبھا میں علی گڑھ یونیورسٹی پر ایک انتہائی زہریلی تقریر کی جس میں انھوں نے یہ بھی کہا کہ وہ ترقی پسندانہ اور سیکولر جذبات رکھتے ہیں، اسی لئے مسلمان ان کے مخالف ہیں، ڈاکٹر سید محمود راجیہ سبھا کے ممبر تھے، لیکن اس تقریر کو سننے کے لئے وہ لوک سبھا کی گیلری میں بیٹھے تھے، چھاگلا صاحب کی تقریر کو سن کر وہ گیلری میں زور زور سے غصے میں اپنا بید فرش پر مارتے تھے، اور کہتے جاتے تھے کہ جھوٹ ہے، بدمعاشی ہے، شرارت ہے، یہ بات لوک سبھا کے آداب کے خلاف تھی لیکن کسی کو ان سے کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی"

۱۹۰۷ء کے بعد وہ مزید تعلیم کے لئے یورپ گئے، انگلستان میں ان کا قیام تین سال تک رہا، کیمبرج سے بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی، پھر جرمنی گئے، وہاں ان کو تاریخ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی، عام طور سے مشہور رہا کہ انھوں نے مولانا شبلی کی کتاب مضامین عالمگیر کا جرمن زبان میں ترجمہ کرکے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری حاصل کر لی تھی، مگر یہ شہرت ان کے حریفوں نے دی، ورنہ مجھ سے خود انھوں نے بیان کیا کہ انھوں نے "مغلوں کے سیاسی نظام سلطنت" پر مقالہ لکھا تھا۔

وہ انگلستان اپنی وطنیت کے جذبہ میں سرشار ہو کر انگریزوں کے خلاف ایک زہریلا ذہن لے کر گئے تھے، مگر وہاں کے قیام میں انگریزوں کی شرافت و اخلاق سے بہت زیادہ متاثر ہوئے، اور یہ اثر ان کی زندگی کے آخری وقت تک رہا۔ مگر انھوں نے اپنے ذہن کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا، سیاسی طور پر تو انگریزوں کے مخالف تھے، لیکن اس سے ہٹ کر

وہ انگریزوں کو ہر طرح پسند کرتے تھے، اُن کی قومی اور معاشرتی خوبیوں کے معترف رہے
انگلستان میں اپنے دو انگریز استاد پروفیسر ایڈورڈ براؤن، اور ولفرڈ بلنٹ سے
زیادہ متاثر ہوئے، پروفیسر براؤن کو ایرانی ادب اور تہذیب سے بڑا شغف رہا، انھوں
نے اپنی تصانیف (A history of persian Literature The-
press and poetry of Modern persia,
The wit and Humour of the persians کی وجہ سے علمی دنیا میں ہمیشہ کیلئے
ایک مستقل جگہ بنالی ہے، وہ ایرانی تہذیب کی دلدادگی میں کبھی کبھی ایرانی لباس پہنے اور ایرانی
حقہ بھی پیتے دکھائی دیتے، مسٹر بلنٹ نہ صرف ممتاز اہل علم بلکہ سیاسیات اور خصوصاً مسلم
ممالک کی سیاسیات کے ماہر سمجھے جاتے تھے، وہ اپنی تصانیف India under-
Ripon' Future of Islam- اور
The secret History of the English-
Occupation of Egypt کے لئے ہندوستان
اور اسلامی ممالک میں بہت مشہور رہے، ان کی شادی انگریزی زبان کے مشہور شاعر
لارڈ بائرن کی نواسی سے ہوئی تھی، ہندوستان کے وائسرائے لارڈ لٹن کے سمدھی
بھی تھے، ایک انگریزی رسالہ بھی نکالا کرتے، کلام پاک برابر مطالعہ میں رکھتے، کہتے
کہ اسلام قبول کرنے کا دل چاہتا ہے، مگر مسلمانوں کے باہمی جھگڑوں کو دیکھ کر
مسلمان ہونے سے باز آجاتا ہوں، عربی پاشا کو جب پھانسی کی سزا دی گئی تو ان
ہی کی کوشش سے وہ پھانسی کے تختے سے اترے، ان کو سیلون جلا وطن کردیا

گیا تو مسٹر بلنٹ وہاں جاکر اُن سے ملے۔ مگر اُن کو وہاں مصریوں میں آپس میں لڑتے دیکھ کر بڑا دُکھ ہوا، انھوں نے پانچ سال عرب میں بدوؤں کے ساتھ بھی گذارے تھے، عربی گھوڑوں کو پسند کرتے تھے۔ اُن کی برائی سننا پسند نہیں کرتے، ایک بار ڈاکٹر صاحب کے ایک دوست نے اُن کے سامنے کہدیا کہ انگریزی گھوڑے زیادہ تیز ہوتے ہیں تو انھوں نے برجستہ کہا کہ مگر عربی گھوڑے زیادہ شریف ہوتے ہیں،

ڈاکٹر صاحب مسٹر بلنٹ کی خوبیوں کا ذکر برابر کرتے رہتے، انھوں نے اس کا بار بار اعادہ کیا کہ مسٹر بلنٹ ہی نے سیاسیات میں ایمانداری کے اصول پر استوار رہنے کا نکتہ ذہن نشین کرایا، اُن کی یہ تلقین کچھ ایسی موثر رہی کہ وہ سیاسیات میں ایمانداری کا ثبوت آخر آخر وقت تک دیتے رہے جس سے اور دوسرے رہنماؤں کی کی طرح وہ زیادہ کامیاب سیاست داں نہ ہو سکے۔ کہتے کہ کسی انگریز ہی نے کہا ہے کہ Consistency in politics is the virtue of an ass مگر وہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں خوش تھے، کہ سیاسی دیانت داری اور وضعداری کا دامن ان کے ہاتھ سے کسی حال میں نہیں چھوٹا،، گو لوگوں کو اُن سے بہت کچھ اختلاف ہوتا رہا۔ ان کا بیان ہے کہ مسٹر بلنٹ اون سے برابر کہتے رہتے کہ

"ہندوستان کی قومی تحریکوں میں مسلمان برابر شریک ہوتے رہیں، ورنہ اُن کی حیثیت باعزت نہیں رہ سکے گی"

یہ نصیحت اُن کے ذہن پہ برابر چھائی رہی،

انگلستان کے قیام میں ڈاکٹر صاحب کے وطنی اور ملی دونوں جذبات
بیدار ہوتے رہے ۱۹۰۹ عیسوی میں ایران کی تقسیم کا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا تھا،
انگریزوں نے وہاں بلوجیکٹ فوج اتار دی۔ مسٹر بلنٹ اور پروفیسر براؤن
دونوں نے اس جھگڑے سے پوری دلچسپی لی۔ ڈاکٹر صاحب دونوں کی صحبت
میں برابر رہا کرتے تھے۔ اس لئے وہ ان ہی کے ذریعہ سے ایران کے
مشہور رہنماؤں میں مرزا یحییٰ اور آقا نقی وغیرہ سے ملتے رہے۔ پھر ایرانیوں
کی حمایت میں ایک جلسہ کرایا۔ پروفیسر براؤن نے اس جلسہ میں منظور کرانے
کے لئے ایک تجویز مرتب کی، جس کو ڈاکٹر صاحب نے لے جا کر مسٹر بلنٹ کو دکھایا!
انھوں نے دیکھ کر کہا یہ تجویز بے جان ہے۔ انگریزوں کی سخت مذمت کرو۔
ان کو گالیاں دو۔ تب ہی ان پر اثر ہوتا ہے۔ پھر انھوں نے خود ہی ایک
بہت ہی سخت تجویز مرتب کی، جلسہ میں جب یہ تجویز ڈاکٹر صاحب نے پیش کی تو
پاس نہ ہوسکی۔ لیکن ایک دوسری تجویز میں سلطان ٹرکی اور امیر افغانستان سے
ایران کے مسئلہ میں مداخلت کرنے کی استدعا کی گئی، اس تجویز سے بھی انگلستان کے سیاسی
حلقہ میں ایک ہلچل مچ گئی،

۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس پر حملہ کیا تو ڈاکٹر صاحب کی اسلامی حمیت بھڑک اٹھی
اور انھوں نے ترکوں کی ہمدردی میں ایک جلسہ کرایا جس میں ان کی دعوت پر مسٹر بلنٹ اور
پروفیسر براؤن بھی شریک ہوئے، اس میں مسٹر بلنٹ نے انگریزوں کے خلاف اپنی سخت تقریر میں
کہا کہ یہ بڑے سازشی ہیں۔ اٹلی کے ساتھ سازش میں شریک ہیں، اگر یہ چاہیں تو طرابلس سے اٹلی کی
فوجیں واپس جاسکتی ہیں، جنگ بلقان کے موقع پر بھی ڈاکٹر صاحب کی اسلامی غیرت ابھری، اس سلسلہ میں مسٹر بلنٹ نے

اُن کو ایک طویل خط لکھا جس کو انھوں نے مولانا محمد علی کے مشہور انگریزی ہفتہ وار اخبار کامریڈ میں شائع کردیا۔ وہ اپنے استاد کا بہت احترام کرتے، مگر بلقان کی جنگ کے سلسلہ میں ان کی رائے سے اختلاف کیا۔ اسی طرح مسٹر بلنٹ کا خیال تھا، کہ اگر خلافت ترکی کے بجائے عربوں کے کسی ملک میں منتقل ہوجاتی تو زیادہ مفید ہوتی۔ مگر ڈاکٹر صاحب اپنے استاد کے اس خیال کو سیاسی مصلحتوں پر مبنی سمجھے۔

ڈاکٹر صاحب نے رسالہ دوام کے ایک انٹرویو میں بیان کیا کہ مسٹر بلنٹ ہندوستان کی سیاحت کے لئے بھی آئے تھے، وہ علی گڑھ پہونچے تو سرسید نے ان کی دعوت کی جس میں ایک انگریز کلکٹر اور ایک انگریز جج کو اپنے دونوں طرف بٹھایا۔ مسٹر بلنٹ کو یہ انگریز نوازی ناگوار گذری، اور اپنی ڈائری میں ان انگریزوں کا ذکر حامی کی حیثیت سے کرکے سرسید کے متعلق لکھا کہ یہ غیر مخلص شخص (Insincere fellow) ہے ڈاکٹر صاحب سرسید کے متعلق یہ رائے پسند نہیں کرسکتے تھے اس لئے وہ خوش تھے کہ مسٹر بلنٹ نے آخر میں یہ رائے بدل دی تھی۔ اور وہ سرسید کو مخلص سمجھنے لگے تھے، اس رائے کی تبدیلی میں یقیناً ڈاکٹر صاحب کا بھی حصہ رہا ہوگا۔ مسٹر بلنٹ اور پروفیسر براؤن کے بہت سے خطوط ڈاکٹر صاحب کے پاس آخر وقت تک محفوظ رہے، انھوں نے ان کو اپنے اس مجموعہ میں شامل کیا ہے، جو انھوں نے "مشاہیر کے خطوط ان کے نام" کے عنوان سے مرتب کیا تھا۔ افسوس ہے کہ یہ اب تک شائع نہیں ہوسکا ہے۔ اس سے ان کی سیاسی سرگرمیوں اور دوسری قسم کی دلچسپیوں کی اور زیادہ تفصیلات معلوم ہوتیں۔

ڈاکٹر صاحب کے قیام انگلستان ہی کے زمانہ میں رائٹ آنریبل جسٹس امیر علی نے لندن میں مسلم لیگ قائم کی تو اُن کو اس کا جائنٹ سکریٹری بنایا۔ اس کے ایک جلسہ میں

سر علی امام نے مشترکہ انتخاب کی تحریک پیش کی تو انھوں نے اس کی تائید کی، اور پھر اس کے لئے مختلف جلسے بھی کرائے، یہ بات جسٹس امیر علی اور سر آغا خاں کو پسند نہ آئی۔ ان سے ڈاکٹر صاحب کا اختلاف بڑھا تو وہ مسلم لیگ سے مستعفی ہو گئے۔ وہ اپنی نجی گفت گو میں کہتے کہ مجھکو اس وقت جداگانہ اور مشترکہ انتخاب کی بحث بالکل فضول معلوم ہوتی، وہ ہر دام پر انگریزوں کی غلامی کا طوق ہندوستانیوں کی گردن سے اتار کر پھینک دینا چاہتے تھے، اس لئے وہ کوئی ایسا جھگڑا پسند نہیں کرتے جس سے ہندوستان کی آزادی میں رکاوٹ پیدا ہونے کا اندیشہ ہو جاتا۔ وہ ہندوستان سے انگریزوں کو جلد سے جلد اسلئے بھی رخصت ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے کہ انکا خیال تھا کہ ہندوستان سے انگریزوں کے اقتدار ختم ہونے کے ساتھ ہی اسلامی ممالک میں بھی ان کا تسلط خود بخود ختم ہو جائے گا وہ اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں:-

"طالب علمی ہی کے زمانہ میں اسلامی جذبے کے ماتحت ہندوستان کی آزادی کی جنگ میں شریک ہوا، اور اپنے دوستوں تصدق احمد خاں شروانی اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے ساتھ اس میدان میں اترا، اس وقت تمام اسلامی ممالک انگریزوں کے مظالم سے تباہ ہو رہے تھے، میرا عقیدہ تھا کہ جب تک انگریز ہندوستان پر مسلط رہیں گے۔ اسلامی ممالک ان کے مظالم سے نجات نہیں پا سکتے، یہی اسلامی جذبہ طالب علمی کے زمانے میں چھایا رہا، جو خلافت کی مذہبی تحریک کے زمانے میں انتہا کو پہونچ گیا جس سے مجھ کو ہر طرح کے مالی و جانی نقصانات اٹھانے پڑے"

وہ انگریزوں کی مخالفت ضرور کرتے رہے۔ مگر اسی کے ساتھ وہ دو انگریزوں کے حوالے اپنی گفت گو میں برابر دیتے۔ دونوں کے نام مجھ کو اس وقت یاد نہیں آرہے ہیں، مگر انھوں نے اُن کا ذکر اپنے اس مقدمہ میں کیا ہے جو انھوں نے مشاہیر کے خطوط کے اس مجموعہ کے لئے لکھا تھا جو ان کے نام سے ہیں، ایک انگریز نے جو برسوں ہندوستان میں رہ چکا تھا، ان سے

۱۹۱۱ء میں کہا کہ آپ ہندوستان کی آزادی چاہتے ہیں مگر یاد رکھئے کہ جب انگریز ہندوستان چھوڑیں گے، تو ہندوستان مختلف ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے گا، ڈاکٹر صاحب اپنی زندگی کے آخری ایام میں اس انگریز کی پیشین گوئی کا ذکر برابر کرتے، اور کہتے کہ سیلون، برما، پاکستان، اور اب بھوٹان بھی آخر واقعی علٰحدہ ہو کر رہے، ایک دوسرے انگریز کی یہ بات بھی دہراتے کہ اس نے اُن سے کہا کہ ہم لوگ جب ہندوستان چھوڑیں گے تو سارے ہندوستانی زبان کے مسئلہ پر کٹ مریں گے۔ ہندوستان میں جو لسانی جھگڑے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، ان پر ڈاکٹر صاحب تاسف کا اظہار کرتے ہوئے اس انگریز کی انجام بینی کی داد دیتے،

کیمبرج کی تعلیم کے زمانے ہی میں ڈاکٹر صاحب اور پنڈت جواہر لال نہرو سے تعلقات پیدا ہوئے۔ جو آخر وقت تک استوار رہے، پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے

"میرے کیمبرج کے ساتھیوں میں کئی آدمی تھے جنھوں نے آگے چل کر ہندوستان میں کانگریس کے کاموں میں نمایاں حصہ لیا۔ ج۔ م۔ سین۔ گپتا، میرے کیمبرج پہنچنے کے تھوڑے دن بعد وہاں سے رخصت ہو گئے۔ سیف الدین کچلو، سید محمود اور تصدق احمد شروانی کم و بیش میرے ہم عصر تھے، شاہ محمد سلیمان بھی جو اب الٰہ آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس ہیں، میرے زمانہ میں پڑھتے تھے، میرے اور ہم عصر سول سروس کے رکن یا وزیر بن کر پھلے پھولے۔"

انگلستان کے قیام ہی کے زمانے میں اُن کو ۱۹۰۹ء میں گاندھی جی سے ملنے کا اتفاق ہوا، وہ وہاں جنوبی افریقہ سے آئے ہوئے تھے، اُن کی ملاقات کچھ ایسی نیک اور مبارک ثابت ہوئی کہ آئندہ دونوں ایک دوسرے کے گرویدہ ہوتے گئے،

وہ ۱۹۱۳ء میں ہندوستان واپس آئے، اس وقت پٹنہ میں سر علی امام کا طوطی بولتا تھا،

ان کا شمار ہندوستان کے ممتاز بیرسٹروں میں تھا وہ ویسرائے لارڈ ہارڈنگ کی ایگزیکیٹیو کونسل کے ممبر بھی رہ چکے تھے، سیاسی خیالات میں قوم پرورانہ رجحانات رکھتے تھے، ان ہی کی خواہش پر ڈاکٹر صاحب نے پٹنہ ہی میں بیرسٹری شروع کی، اور نمایاں کامیابی حاصل کرنے لگے، مگر ہندوستان کی آزادی کی جو شمع ان کے دل میں روشن ہوئی تھی، وہ جلتی رہی، اسی لیے سیاسیات میں بھی حصہ لیتے رہے اُس زمانہ میں مسٹر مظہر الحق بھی جو بعد میں اپنی داڑھی اور مذہب کی وجہ سے مولانا مظہر الحق کہلانے لگے تھے ہندوستان کے چوٹی کے بیرسٹروں میں تھے، اُن کی نظر ڈاکٹر صاحب کی طرف اٹھی، اور اپنی صاحبزادی سے اُن کی شادی ۱۹۱۵ء میں کردی، مسٹر مظہر الحق کانگرس کی تحریکوں میں نمایاں حصہ لیتے تھے۔ ان کی صحبت میں بھی ڈاکٹر صاحب کی وطنیت کی کیمیا کو ضرور آنچ ملی۔ چنانچہ وہ ۱۹۱۵ء میں آل انڈیا کانگرس کے ممبر بنے، اور اس وقت سے زندگی کے آخری لمحہ تک مخلص کھدر پوش کانگرسی رہے،

اُن کو شعر و شاعری، اور تاریخ کا بڑا اچھا ذوق رہا، مگر ان پر سیاست کچھ ایسی حاوی رہی کہ وہ ادبی اور تاریخی کتابوں کا مطالعہ کرتے، تو ان میں بھی اپنے ملی اور وطنی جذبات کی تشنگی بجھانے کی کوشش کرتے، مثلاً اُن کو غالب کے کلام سے بڑی دلچسپی رہی، انھوں نے غالب پر ایک مقالہ ۱۹۱۹ء میں لکھا، اس میں انھوں نے غالب کی شیریں بیانی، فصاحت بلاغت بلندی خیال، ذکاوت تعمق خیال، وسعت نظر، عالمگیر ہمہ ردی، غم خواری، انسان اور اس کے فضائل سے گہری واقفیت، مشکل گوئی کے ساتھ طرز ادا کی سادگی، تشبیہوں کی جدت استعاروں کی تازگی، بلند پروازی کے ساتھ شوخی وغیرہ کی تعریف کرتے، اور اُن کی مثالیں دیتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ ان کا کلام ہر زمانہ میں انسان کے دلی جذبات و خیالات کی تفسیر کر کے لوگوں کو خوش کرتا رہے گا، ان کا کلام شیلی کی پرواز، کیٹس کی فصاحت، گوئٹے

کی عمیق النظری، شلر کی بلند خیالی، ٹامسن کے تخیل، مومن کے درد، سودا کی ظرافت اور میر کی سادگی کا مجموعہ ہے، یہ تعریف غالب اپنے کانوں سے سنتے تو اپنی نا قدری کی شکایت نہ کرتے، مگر اسی کے ساتھ اس مقالہ میں ڈاکٹر صاحب یہ بھی لکھ گئے، کہ غالب کی غزلوں کے اشعار میں اُن کے زمانہ کے خونچکاں سیاسی واقعات کی عکاسی نظر آتی ہے مثلاً ۱۸۵۷ء سے پہلے ہندوستانیوں کی زندگی کا خاتمہ ایک قوم کی حیثیت سے ہو چکا تھا، سیاست دانوں کی طرح غالب نے بھی اپنے گہرے احساس سے اس کو محسوس کیا، اور پُر درد پیرایہ میں اس کا اظہار یہ کہہ کر کیا:

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

اسی بات کو دوسرے انداز میں اس طرح کہتے ہیں:۔

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہی اپنی قسم ہوئے

۱۸۵۷ء میں دہلی تباہ ہوئی، بندگانِ خدا بے خانماں ہوئے، شرفاء کے مکان ویران اور برباد کردیئے گئے، پورا شہر صحرا ہو گیا تو غالب اس کی تصویر اس طرح پیش کرتے ہیں:۔

کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

مسلمانوں پر جو مظالم توڑے گئے، اُن کو دیکھ کر غالب نے کہا

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

پھر انگریزوں نے ہندوستان کی تہذیب کو جس طرح مٹایا اس کا اثر غالب کے دل پر بھی ہوا، انھوں نے پوشیدہ طور پر اس کا دردناک مرثیہ لکھا، جو حقیقتہً دل کو ہلا دینے

والا ہے، اور یہ ہندوستان کی مٹی ہوئی عظمت کو یاد دلا کر خون کے آنسو رلواتا ہے، اس کی مثال اس قطعہ کے اشعار میں ملتی ہے، جو حسب ذیل شعر سے شروع ہوتا ہے

ظلمت کدہ میں میرے شب غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے

ملک کی کھوئی ہوئی آزادی پر اُن کے آنسو کبھی نہیں تھمے، اس لئے فرماتے ہیں۔

یاد تھیں ہم کو بھی رنگارنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

اسی قسم کے اور بہت سے خیالات کا اظہار کر کے آخر میں لکھتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو ہندو مسلمان کے اتحاد کی تلقین اس طرح کرتے ہیں:۔

زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رہ رو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

ڈاکٹر صاحب کا یہ مضمون نظامی بدایونی کی شرح کلام غالب کے پانچویں اڈیشن میں بھی شامل ہے۔ اس پر آسی مسعود، یگانہ چنگیزی، ڈاکٹر سید عبداللطیف، شیخ اکرام وغیرہ نے بڑی سخت تنقیدیں کیں، اور پھر یہ بھی ثابت کیا گیا کہ ڈاکٹر صاحب نے جن اشعار کو غدر کی تباہی وغیرہ سے منسوب کیا ہے وہ غدر سے بہت پہلے لکھے جا چکے تھے، ڈاکٹر صاحب کو جب اشعار کے کہنے کا زمانہ معلوم ہوا تو پھر انھوں نے اپنے خیالات سے رجوع کر لیا۔ مگر وہ غالب کی وطن پرستی کے آخر وقت تک معترف رہے۔ میں نے اپنی زیر تالیف کتاب "غالب مدح و قدح کی روشنی میں" ڈاکٹر صاحب کے اس مضمون پر مفصل تبصرہ کیا ہے۔ اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ انھوں نے جو اشعار غالب کی وطنیت کے ثبوت میں پیش کیے ہیں، وہ تو یقیناً وطنی جذبے میں نہیں لکھے گئے لیکن اُن کے

مجموعۂ کلام میں بنارس، پٹنہ، کلکتہ کی جو مداحی ہے، یا اُن کے خطوط میں دہلی سے جو محبت اور لگاؤ کا اظہار ہے، یا اُن کے مکتوبات اور دستنبو میں دہلی کی تباہی اور بربادی کی جو خونچکاں تفصیلات ہیں، یا پھر اُن کو اپنے ہندو شاگردوں اور دوستوں سے جو شیفتگی رہی، اور موقع بموقع اپنی رواداری اور بے تعصبی کا ثبوت دیتے رہے، اس سے اس زمانہ کے معیار کے مطابق اُن کی وطنیت، جذباتی ہم آہنگی اور باہمی اتحاد کا اظہار ضرور ہوتا ہے، ڈاکٹر صاحب نے میری کتاب کا یہ حصہ اصرار کر کے مجھ سے سُنا اور سُن کر فرمایا کہ جس طرف میری نظر پہلے نہیں گئی تھی، تم نے منتقل کرادی، میرے مضمون میں میرے دلائل صحیح نہ ہوں، لیکن میں مطمئن ہوں کہ میں جس نتیجہ پر پہنچا تھا، وہ صحیح تھا، خوش ہوں کہ میرے مضمون ہی کی بدولت غالب کے پرستار غالب کے کلام اور تصانیف کو میری نگاہ سے بھی مطالعہ کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔

ان کا ادبی اور علمی ذوق اُن کے سیاسی ذوق کی وجہ سے دبتا چلا گیا، ۲۱-۱۹۲۰ء میں خلافت اور ترک موالات کی تحریکیں دونوں ساتھ چل نکلیں تو انھوں نے ۱۹۲۱ء میں اپنی پریکٹس چھوڑ دی، اسی سال مرکزی خلافت کمیٹی کے جنرل سکریٹری بنائے گئے، مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی کے ساتھ بمبئی میں رہنے لگے، مولانا عبدالماجد دریابادی نے ان کی وفات پر جو تأثراتی مضمون لکھا ہے، اس میں وہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"آل انڈیا خلافت کمیٹی کے سکریٹری کی حیثیت سے کام بڑے جوش و خروش اخلاص و کامل دیانت کے ساتھ کیا، جب ۱۹۲۱ء میں علی برادران قید ہو گئے تو اُن کی والدہ بی اماں مرحومہ کے دوروں کا انتظام کرایا، ان ہی دنوں انھوں نے ایک انگریزی کتاب "خلافت اینڈ انگلینڈ" لکھی، اور بھی بہت کچھ لکھا لکھایا، اسٹیٹسمین اس وقت طاقتور اخبار تھا، خلافت والوں

کی دیانت و امانت پر زور و شور سے حملہ آور ہوا، دفاع میں سید محمود بھی میدان میں اترے
دلائل و اعداد کی توپوں سے اس مورچہ کو سر کرلیا۔

خلافت کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے ان کی سرگرمیوں کا کچھ اندازہ مولانا
ابوالکلام آزاد کے حسب ذیل خط سے بھی ہوگا،

۲۶ - رپن لین کلکتہ

جمی فی اللہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! تار اور پھر خط پہنچا، آپ کا
خط رمضان سے چند یوم پیشتر آیا تھا اور میں نے بروقت جواب دیدیا تھا، منتظر تھا کہ اس کا جواب آپ کی
جانب سے موصول ہو تو بعض امور موعودہ کی نسبت لکھوں، بہرحال اب آپ کا منتظر ہوں اور احتیاطاً خط
کا جواب بھی روانہ کر رہا ہوں، بہار کیلئے میری جانب سے کبھی کوتاہی نہ ہوگی، بشرطیکہ کم سے کم
آپ پوری طرح مستعد ہوں، گاندھی جی سے بعض ضروری امور طے کرنے ہیں، اس لئے غالباً میں
عید کی شام ہی کو بمبے کے لئے روانہ ہو جاؤں اور پھر واپسی میں بانکی پور ٹھہروں، آپ بہار کے
لئے ایک منظم اور طے شدہ پروگرام طیار کر رکھیں، اور میرے لئے ایک ایک دن صرف ان جگہوں
میں ٹھہرائیں، جہاں واقعی اور ناگزیر ضرورت ہو کیونکہ علاوہ بمبئی اور مرکزی خلافت کی ضروریات
اور باہر کے عاجزکن تقاضوں کے خود بنگال کا تمام کام ویسا ہی دھرا ہے، اور شوال میں اس کیلئے
کافی وقت نکالنا نہایت ضروری ہے، ۱۴ / جون سے ۲۵ تک بنگال کے لئے قرار دے چکا
تھا، اور بعض مقامات کو مطلع بھی کرچکا تھا، لیکن آپ کے خط کی وجہ سے بہار کو ترجیح دی، اور
بنگال کی تاریخیں پیچھے ڈالدیں، پس اس کا لحاظ رہے کہ کم سے کم وقت وہاں صرف ہو، اور
صرف ناگزیر اور واقعی ضروری مقامات سردست منتخب کرلئے جائیں، پھر جولائی میں انشاءاللہ
بقیہ مقامات کا بھی دورہ ہو رہے گا،

امید ہے کہ آپ کی آمادگیاں جس کا میرٹھ میں تذکرہ ہوا تھا، قائم ہوں گی بلکہ مزید محکم و استوار۔ میں نے طے کر لیا ہے کہ کچھ دنوں معیت رہے، اور آپ کی خواہش کے مطابق سفر و حضر میں یکجائی ہو، علی الخصوص سفر میں، خدا نے چاہا تو موجب نتائج و ثمرات ہوگا۔

امید ہے کہ مسٹر مظہر الحق (جن کو اب بقاعدۂ عام مولانا مظہر الحق کہنا چاہئے اگرچہ وہ اس سے خوش نہ ہوں گے) بدستور مشغول و منہمک ہوں گے اب ان سے ملنے کو بہت جی چاہتا ہے، اللہ تعالیٰ اُن کے ایثار و اخلاص کو مزید قبولیت و ثمرات عطا فرمائے،

(فقیر ابو الکلام احمد کان اللہ لہ)

۱۹۲۲ء میں جب خلافت اور ترک موالات کی تحریکیں بڑے شد و مد کیساتھ بڑھیں تو ہزاروں محبانِ وطن کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کو بکسر شاہ آباد (بہار) کے برطانوی جیل خانہ کی تنگ و تاریک کوٹھری میں بند ہونا پڑا، اس وقت ہندو مسلمان کے اتحاد کا بڑا ہی شاندار منظر دیکھنے میں آتا تھا، گاندھی جی، موتی لال نہرو، سی۔ آر۔ داس، جواہر لال نہرو، مولانا شوکت علی، محمد علی، ابو الکلام آزاد، حکیم اجمل خان وغیرہ شمع اتحاد کے پروانے بنے ہوئے تھے ہر شخص اپنے اپنے نقطۂ نظر سے ہندو مسلمان کو ایک دوسرے سے قریب تر کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا، ڈاکٹر صاحب کا بھی یہ جذبہ اپنی انتہا تک پہونچ گیا تھا، مگر جیل ہی میں انھوں نے ایک تحریر لکھنی شروع کی، جو پہلے تو روزنامۂ خلافت بمبئی میں کئی مہینوں تک باقاعدہ شائع ہوتی رہی۔ پھر نظامی ایجنسی بدایوں سے ۱۹۵۰ء میں کتابی شکل میں "آج سے قبل کا ہندوستان" کے نام سے شائع ہوئی،

اس کتاب میں جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے علی گڈھ کے ہندو مسلمان طلبہ کی مجلسی گفتگو کے ذریعہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں ذہنی موانست اور باہمی یگانگت پیدا کرنے کی خاطر ان

کی گذشتہ تاریخ کی کچھ تفصیلات بیان کی گئی ہیں، یہ بظاہر کوئی تحقیقی کتاب نہیں لیکن اس میں جو معلومات فراہم کی گئے ہیں. وہ تاریخ ہند کے محققوں کیلئے سبق آموز اور مشعل راہ بھی ہیں۔ سارے تاریخی واقعات عبد الرحمن (بجنوری) کے ذریعہ سے بیان کئے گئے ہیں۔ لیکن یہ عبد الرحمن دراصل خود ڈاکٹر صاحب ہیں، جو کچھ کہنا چاہتے تھے۔ عبد الرحمن کی زبانی کہہ گئے ہیں، اپنا نام کہیں آنے نہیں دیا ہے۔ جو اُن کی کسر نفسی کی دلیل ہے، اُن کا آخر وقت تک خیال رہا کہ ہندو مسلمانوں میں اختلاف، پھوٹ، اور کدورت کی ایک بڑی وجہ یہ رہی کہ وہ اپنے تعلیمی اداروں میں ہندوستان کی تاریخ کیا پڑھتے ہیں، بلکہ اسکے ذریعہ سب ملے دودھ پیتے رہتے ہیں۔ اسی کو پی کر جوان ہوتے ہیں۔ انہوں اس کتاب میں اسی بس کو دور کرنے کی کوشش کی،

انھوں نے مسلمانوں کو یہ سمجھایا کہ اگر وہ ہندوؤں کے مذہب اُن کے مقدس رشیوں اور بزرگوں کے طریق علم وعمل کا مطالعہ کریں، تو اُن کو معلوم ہوگا کہ ہندوؤں کے یہاں بھی خدا پرستی کی پوری شان اور توحید کی سچی تصویر نظر آئے گی، ہندو بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ خدا ایک ہے، اس کی ابتدا اور انتہا نہیں، ہر جگہ موجود ہے، پاک ہے، اپنی مرضی سے جو چاہتا ہے کرتا ہے، قادر مطلق ہے، دانائے کل ہے، زندگی بخشتا ہے، حکومت کرتا ہے، سب کی حفاظت کرتا ہے اپنی بادشاہی میں نرالا ہے، وغیرہ وغیرہ، وہ اس کے ضرور قائل ہیں، کہ خدا انسان کی صورت میں جنم لیتا ہے، اسی کو اوتار کہتے ہیں، مگر وہ اوتار کو خدا نہیں تسلیم کرتے، وہ بت کو ضرور سامنے رکھتے ہیں، لیکن وہ دراصل اس کی پرستش نہیں کرتے۔ بلکہ اس کو اپنی دلجمعی کا وسیلہ سمجھتے ہیں، تاکہ ان کا دل دوسری طرف منتشر نہ ہو) وہ اپنی مدد خدا ہی سے ڈھونڈھتے ہیں، اور اسی کی پاکی کو سب سے برتر سمجھتے ہیں، اُن کی

مقدس کتاب رگ وید کا بڑا حصہ عبادت اور خدا کی تعریف سے بھرا ہوا ہے، اُن کی اور مذہبی کتابوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے دلوں میں خدا کا خوف اور نیکی کرنے کا ذوق رہا، ان میں بھی سخاوت، مروّت، شجاعت اور شرافت، نیکی، نیک خیالی، ہمدردی، رواداری، سیرچشمی، وضعداری، اور سعادت مندی کی تعلیمات ہیں، اُن کی تہذیب، تمدن، علم شاعری، فلسفہ، اخلاقیات، ریاضیات، نجوم، منطق، موسیقی، فنِ تعمیرات، زراعت، پارچہ بافی، رنگ سازی وغیرہ کی بھی ترقی ہوتی رہی، ڈاکٹر صاحب نے مسلمانوں کو ان ساری باتوں کے روادارانہ طور پر مطالعہ کرنے کی تلقین کی،

پھر انھوں نے ہندوؤں کو یہ سمجھایا کہ وہ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کو اتنا برا نہ تصور کریں جیسا کہ وہ کرتے ہیں، پھر ہر مسلمان حکمراں کی کچھ نہ کچھ خوبیاں بتائیں، مثلاً انھوں نے بتایا کہ محمد بن قاسم اتنا روادار تھا کہ جب وہ سوا تین برس حکومت کر کے خلیفہ کے حکم سے واپس بلایا گیا تو تمام ہندو اس کے لئے زار زار روتے تھے کیمبرج میں اس کا بت بنا کر ایک عرصہ تک پوجتے رہے، محمود غزنوی نے اپنی ساری عمر میں کسی ایک ہندو کو بھی بزور مسلمان نہیں بنایا، راجہ تلک اس کا میر منشی اور پھر سپہ سالار مقرر ہوا، اس کو دربار کے تمام امراء پر فوقیت حاصل تھی، ایک دوسرا ہندو شیوندرائے نامی بھی اس کی فوج کا سپہ سالار تھا، ناتھو نامی ایک اور ہندو محمود کی فوج میں ایک بڑے عہدے پر مامور تھا، ایک اور فوجی کمانڈر بجے رائے نامی تو محمود کا خاص دوست سمجھا جاتا تھا، اس کا دربار شاہی میں بڑا رتبہ تھا، محمود گجرات، پنجاب، قنوج میں پھرتا رہا لیکن وہاں کے مندر نہیں ڈھائے، عربوں کے زمانہ میں ملتان کے ایک مندر کو گرا کر اس جگہ مسجد بنائی گئی تھی، اُس نے ملتان فتح کیا تو اس مسجد کو نماز کے لئے بند کر دی کہ وہ غصب سے حاصل ہوئی تھی، اس نے سومنات کا مندر ضرور گرایا، لیکن

اس نے متھرا کے مندروں کو صرف اس لئے چھوڑ دیا کہ وہ نہایت خوبصورت بنے ہوئے تھے، شہاب الدین غوری بڑا خدا ترس حکمران تھا، اس کو اپنی رعایا کی بہبودی کا بہت خیال رہا، التمش کی عدل پروری کی شہرت دور دور تک تھی، رضیہ میں وہ تمام خوبیاں تھیں جو کسی اچھے سے اچھے حکمراں میں ہوسکتی ہیں، نصیر الدین محمود دنیا کی تاریخ میں بڑا عادل، نیک نفس اور خدا ترس بادشاہ سمجھے جانے کا مستحق ہے، بلبن کی حکومت انصاف و عدل کے لئے ہمیشہ ہندوستان میں یاد کی جائے گی، جلال الدین خلجی کی نیک چلنی، رحم دلی، اور دشمنوں کے ساتھ شریفانہ سلوک کے سب ہی مداح تھے، علاء الدین خلجی کے زمانے میں غلے کی ایسی ارزانی تھی کہ پھر کبھی ہندوستان کو ایسی نصیب نہ ہوئی، اس کے عہد میں ایک شخص بنگالہ سے کابل اور مالابار سے کشمیر تک بلا خوف و خطر قیمتی سامان کے ساتھ سفر کرتا تھا، اُس نے ملک کے دفاع کا ایسا اچھا انتظام کیا کہ مغل برابر پسپا ہوکر واپس جاتے رہے، محمد تغلق نے تمام ملک میں شفاخانے بنوائے، صرف دہلی میں ستر شفاخانے تھے، بارہ سو اطبا ملازم تھے، غربا و مساکین کے لئے خیرات خانے تھے، جن میں غریب ہندو مسلمان کو خیرات بٹتی تھی، ملک میں تعلیم کا خاص انتظام تھا، صرف صوبہ دہلی میں ایک ہزار کالج تھے، فیروز شاہ تغلق نے بڑے بڑے شہر آباد کئے، نہریں جاری کیں، بے شمار میووں کے باغات لگائے گئے، صرف شہر دہلی میں بارہ سو باغات تھے، رعایا خوشحال رہی اُن کے پاس دولت، مال، زیور، سونا اور چاندی کی کثرت رہی، خضر خاں اپنے امراء اور رعایا میں ہر دلعزیز رہا، سیدوں کے زمانہ میں ہندوؤں کو سلطنت کے امور میں بڑا دخل تھا، سدانند اور سدا پال دربار کے بڑے معزز امرا تھے، وہ امروہہ، بیانہ، قنوج اور گہرام کے گورنر مقرر ہوئے، سکندر لودی جفاکش رحم دل، منکسر، نیک طینت، اور

نیک طبع بادشاہ تھا مغلوں کی حکومت کی تعریف تو غیر بھی کرتے ہیں ان کے دور حکومت میں ہندوستان عروس البلاد بن گیا تھا اس دور میں شیر شاہ کے ساتھ بابر ہمایوں، اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کے کارناموں سے کوئی انکار نہیں کرسکتا، اورنگ زیب ہندوؤں میں ضرور بدنام ہے لیکن اگر وہ چند الزامات سے اپنے کو بری رکھتا، اور اس کی طبیعت دو ایک برائیوں سے صاف ہوتی، تو شاید وہ دنیا کے چند مشہور بادشاہوں کے ساتھ شمار کیا جاتا، شجاعت، ہمت، اولوالعزمی، استقلال، محنت، تہذیب علم، بردباری عقل و فراست میں اورنگزیب اپنا نظیر نہیں رکھتا تھا، اس پر مندروں کے منہدم کرنے کا الزام رکھا جاتا ہے اگر اورنگزیب ایک موقع پر بنارس کے گورنر کو لکھتا ہے کہ میں نے سُنا ہے کہ بعض لوگ بنارس کے برہمنوں اور ہندوؤں کو اُن زمینوں پر جو ہندوؤں کی ہیں، اور قدیم زمانے سے انہی کے قبضہ میں ہیں، بُت خانے بنانے سے روکتے ہیں، اس وجہ سے وہاں کے ہندو پریشان اور متردد ہیں، تم کو حکم دیا جاتا ہے کہ ان کو بُت خانہ اپنی زمین پر بنانے سے کوئی شخص نہ روکنے پائے، اور نہ ان کی عبادت میں کوئی مزاحم ہو، تاکید جانو"

پھر اسی اورنگ زیب نے ہندو مندروں کے لئے جاگیریں دیں، پجاریوں کے لئے وظیفے مقرر کئے، بہت سے مندروں کے پجاریوں کے پاس امداد کے سلسلہ میں اس کے شاہی فرامین موجود ہیں، مغلوں کے آخر زمانے میں ہندو امرا، دربار پر چھائے رہے، رتن چند اور راجہ اجیت سنگھ تو سید عبد اللہ اور سید حسین کے ساتھ سلطنت کے کاموں میں برابر کے شریک دار رہے۔ رتن چند کے اختیارات تو اتنے وسیع تھے کہ ساری سلطنت میں قاضیوں کی موقوفی اور بحالی اسی کے ہاتھ میں تھی، محمد شاہ کے عہد میں چھبیلا رام احمد آباد

کا گورنر، رائے بسنت رام آگرہ کا گورنر اور راجہ خوشحال رائے اس کا سکریٹری تھا، اودھ میں نواب شجاع الدولہ کی سلطنت کا دراصل مالک راجہ بینی بہادر تھا، نواب صفدر جنگ کے وقت میں فوج کا کمانڈر انچیف مہاراجہ نول رائے تھا، آصف الدولہ کے زمانہ میں راجہ سورت سنگھ بریلی کا گورنر تھا، اور خوشحال رائے بخشی الممالک، پھر بعد میں وہ الہ آباد کا گورنر ہوا، بنگال میں راجہ موہن لال سراج الدولہ کا دیوان اور اس کی سلطنت کا مختار کل تھا، اسی کے زمانہ میں راجہ رام نرائن بہار کا گورنر رہا۔ الخ

ڈاکٹر صاحب کی کتاب سے مثالیں گو بہت زیادہ پیش کر دی گئی ہیں لیکن ان کو پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے وطنی جذبے کی بنا پر اگر ہندوؤں کے مذہب اور تاریخ کو برا کہنے کے روادار نہ تھے، تو پھر اپنے ملی جذبات کی بنا پر نہ صرف اسلام، بلکہ مسلمان حکمرانوں کے بارہ میں بھی اُن کی برائیاں سننا پسند نہیں کرتے تھے بلکہ ان کو اچھا سمجھنے کی تلقین کرتے، ان ہی وطنی اور ملی جذبات کی ملی جلی شکل کا نام ڈاکٹر سید محمود تھا، اگر ان پر کبھی ضرورت سے زیادہ وطنی جذبہ غالب ہو جاتا، تو کبھی ملی جذبات سے بھی وہ مغلوب ہو جاتے، ان کے ان دونوں مشترک جذبات کی قدر کرنے والے زیادہ نہ تھے، مگر جنھوں نے قدر کی، اُن کی نظروں میں وہ باوقار رہے،

وہ ۱۹۲۳ء میں پنڈت موتی لال نہرو کے ساتھ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری مقرر ہوئے، اسی کے بعد وہ نہرو خاندان سے ایسے وابستہ ہوتے گئے، کہ وہ اس خاندان کے رکن معلوم ہونے لگے، کانگریس کی سیاسی سرگرمیوں میں اُن کا برابر کا حصہ رہا، مگر ۱۹۲۳ء کے بعد ملک میں ہندو مسلم یگانگت کا وہ خوشگوار منظر دیکھنے میں نہیں آیا، جو ۲۱-۱۹۲۰ء کے عدم تعاون اور خلافت کی تحریکوں کے زمانہ میں آیا تھا، دو تین سال کے اندر

ہی ہندو مسلمان کے تعلقات بگڑنے لگے، کشیدگی بڑھی، فرقہ وارانہ فسادات ہونے لگے، عدم تعاون اور خلافت دونوں کی تحریکیں بے جان سی ہوتی چلی گئیں، ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۲۵ء میں پھر اپنی پریکٹس کی طرف توجہ کرنی چاہی، مگر اُن پر گاندھی جی، موتی لال نہرو، اور جواہر لال نہرو کا ایسا دباؤ پڑا کہ سیاسی کاموں سے الگ نہ رہ سکے، ۱۹۲۶ء میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری کا عہدہ اُن کو دیا گیا، لیکن انھوں نے انکار کیا،

میں نے اُن کو پہلی دفعہ مظفر پور (صوبہ بہار) میں ۱۹۲۶ء میں دیکھا تھا، وہاں مولانا شوکت علی تشریف لانے والے تھے۔ ریلوے اسٹیشن پر بہت سے مسلمان اُن کے استقبال کے لئے پہونچے، میں بھی اُن کے ساتھ تھا، جاڑے کا موسم تھا، گاڑی صبح کے وقت پہونچی تھی، اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ فرسٹ کلاس کا دروازہ کھولا گیا، مولانا شوکت علی ڈبے کے پھاٹک پر نمودار ہوئے، تھوڑی دیر میں ڈاکٹر سید محمود بھی دکھائی دیئے، اس زمانہ میں کانگریس سے مسلمانوں کی بدگمانی شروع ہو گئی تھی، اس لئے ڈاکٹر صاحب سے مسلمانوں نے کوئی خاص گرمجوشی نہیں دکھائی، ایک صاحب میری بغل میں کھڑے تھے، انھوں نے کہا کہ یہ ہندوؤں کے خاص آدمی ہو گئے ہیں، میں خاموش رہا، ڈاکٹر صاحب کی صحبت میں رہنے کے بعد یہ وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ خریدے نہیں جا سکتے تھے، وہ اپنے وطنی جذبے میں جو کچھ کرتے رہے، اس میں اُن کا صرف اخلاص تھا، یہ اور بات ہے کہ ان کے مخلصانہ جذبات کو مسلمان مشکوک نگاہوں سے دیکھتے رہے، دیکھنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ ڈاکٹر صاحب کے وطنی جذبات کو تو ہندو پریس میں خوب اچھالا جاتا، لیکن وہ مسلمانوں کی ہمدردی میں جو کچھ کہتے یا کرتے، وہ پریس میں بلیک آوٹ ہوتا رہتا، ڈاکٹر صاحب کی طرح دوسرے کانگریسی اور نیشلسٹ مسلمانوں کی سیاسی زندگی کا بھی

یہی المیہ رہا، اُن کی زندگی کا ایک ہی رُخ پریس میں آیا، دوسرے رُخ پر پردہ پڑا رہا، اس سے ملک کو بھی نقصان پہونچا مسلمان کانگریسی رہنما مسلمانوں کے لئے جو ہمدردانہ جذبات رکھتے تھے، وہ بھی پریس میں آتے رہتے تو اُن کی قیادت بھی ضرور موثر اور مفید ہوتی رہتی، ڈاکٹر صاحب ہی کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ اس زمانہ میں انھوں نے مسلمانوں کی ہمدردی میں بہت کچھ کیا،

مثلاً ملابار میں موپلاؤں پر بڑے مظالم ڈھائے گئے، اُن کو ٹرین کے ڈبوں میں جانوروں کی طرح بھر بھر کر جلاوطن کیا گیا، اُن کے گھر برباد کر دیئے گئے، اُن کو اپنی املاک سے محروم کر دیا گیا، ان مظالم کی تحقیقات کے لئے پہلی آواز ڈاکٹر صاحب ہی نے اٹھائی، پھر سرحد کے پٹھانوں کے ساتھ بھی جو مظالم ہوئے، اُن کی تحقیقات کی تحریک بھی اُن ہی کی کوشش سے ہوئی، لیکن یہ سب کچھ پریس میں نہیں آیا، اور عام مسلمان بھی سمجھتے رہے کہ ڈاکٹر صاحب وہی سب کچھ کرتے ہیں جو کانگریس کرنے کو کہتی ہے،

۱۹۲۹ء میں ڈاکٹر صاحب آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری بنائے گئے، اس فرض کو وہ ۱۹۳۰ء تک انجام دیتے رہے، اس دور کی کانگریس کی تاریخ میں اُن کا نام بھی نمایاں طور پر لکھے جانے کا مستحق ہے، اُن کی اس زمانہ کی پوری سرگرمیوں کا احاطہ کرنا اس کتاب کا مقصد نہیں،

۱۹۳۰ء میں وہ سول نافرمانی کی تحریک کے سلسلہ میں پھر جیل گئے، اُن کے جیل جانے سے پہلے آل انڈیا کانگریس کمیٹی غیر قانونی قرار دی گئی، تو انھوں نے خفیہ مسنجر سسٹم کا طریقہ اختیار کیا، جس سے کانگریس کو اُس کے کاموں میں بڑی مدد

ملی، پھر انہی کی مساعی جمیلہ سے ہندوستان کے کپڑوں کی ملوں پر کانگریس کا اقتدار حاصل ہوا۔ کانگریس میں مسلمانوں کی آواز کو موثر بنانے کے لئے ۱۹۳۰ء میں مسلم نیشنلسٹ پارٹی کے قیام کو عمل میں لائے، پھر ۱۹۳۲ء میں ہندو مسلمان کو ایک دوسرے سے قریب تر کرنے کے لئے ایک اتحاد کانفرنس کی تجویز پیش کی، جو الہ آباد میں بلائی گئی، اس میں ہندوؤں کے تمام سربرآوردہ رہنما شریک ہوئے، ڈاکٹر صاحب اس کانفرنس کے نتیجہ سے خوش تھے کہ اس میں مسلمانوں کے تحفظات اور مطالبات کے تمام بنیادی اصول مان لئے گئے تھے، جو بعد میں برطانوی حکومت کے ۱۹۳۵ء کے کمیونل اوارڈ کی شکل میں نمودار ہوئے۔

ان کی سیاسی سلامت روی اور دیانت داری کا ایک بڑا ثبوت یہ بھی ہے کہ مولانا محمد علی کبھی اُن سے بدظن نہیں ہوئے، مولانا محمد علی کو کانگریس سے اختلاف ہوا تو وہ اس سے دور ہوتے چلے گئے، ڈاکٹر صاحب برابر کانگریس سے وابستہ رہے، اس کے باوجود مولانا محمد علی کو اُن کی ذات پر پورا اعتماد رہا، اُن کو آخر وقت تک عزیز رکھا، ان کو خط لکھتے تو "پیارے محمود" سے مخاطب کرتے، اور کھل کر اپنے دل کی باتیں لکھتے، ۲۸ مئی ۱۹۲۹ء یعنی اپنی وفات سے تقریباً ڈیڑھ سال پہلے ڈاکٹر صاحب کو ایک مکتوب لکھا اُسکے کچھ ٹکڑے یہ ہیں:

پیارے بھائی بظاہر دو سال ہمارے character کے امتحان کا زمانہ ہے، سنسب کا پر کھیا ہو رہا ہے، ہم لوگ دشمنان ملک اور رہزنان ملت ہیں، آج ...... زرطلب ملک پر ور ملت دوست ہے، ...... جن کو ساری عمر ہم نے گالیاں دیں اور کوسا، یہ ہم کو اپنا آلۂ کار بنانا چاہتے ہیں، سو جس طرح ہم مالوی اور منجے کے یا نہرو اور چنتامنی کے آلۂ کار نہیں بن سکتے اسی طرح شفیع اور عبدالرحیم کے بھی آلۂ کار نہیں بن سکتے

اس وقت سوائے اس کے چارۂ کار ہی کیا ہے، کہ دوا سے تھک کر دعا کے لئے
ہاتھ اٹھائیں، اور مسلمانوں اور ہندوستان والوں کو خدا کے سپرد کردیں، اور اس وقت کا انتظار
کریں جب کہ یہ اپنے نئے رہنماؤں کی ہدایت کا مزہ چکھ کر پھر ہمارے پاس آئیں گے اور التجا
کریں گے، چلو ہمیں انگریزوں اور اُن کے ہندو اور مسلمان غلاموں سے نجات دلا دو، خدا
وہ وقت جلد لائے، یا ہمکو جلد اس دنیا سے اٹھالے، آمین، بہن اور بھتیجیوں کو پیار،

"تمہارا بھائی محمد علی"

مولانا عبدالماجد دریابادی مولانا محمد علی کے بڑے پرستاروں میں ہیں، اُن سے
گہرے ذاتی تعلقات بھی رہے، ڈاکٹر صاحب سے بھی اُن کے مراسم تھے، اُن کے اور علی
برادران کے تعلقات پر بڑا اچھا تبصرہ کیا ہے، :-

"سید محمود بڑی خوبیوں کے مالک تھے، خصوصاً مشرقی قسم کی اخلاقی خوبیوں کے
دردمندی، انکساری، مہمان نوازی اور سب سے بڑھ کر مروّت کے، شروع میں علی برادران
سے خوب نبھ گئی، لیکن آگے چل کر کہنا چاہئے ۲۹-۱۹۲۸ء میں جب گاندھی جی اور علی برادران
میں اختلاف ہوا، تو بیچارے کی پوزیشن عجب نازک سی ہوگئی، ادھر گاندھی جی کا اعتماد انہیں
پورا حاصل تھا، اُدھر یہ بھی گوارا نہ تھا کہ بات علی برادران کی ضائع ہو، چھوٹی کمیٹیوں
میں ووٹ دیتے وقت عجب کشمکش میں پڑ جاتے، اور کوشش اپنی والی یہی کرتے کہ مروّت
کی عدالت سے ڈگری کسی کے خلاف بھی نہ صادر ہونے پائے، بے تکلف دوستوں پر
راز کھل گیا تھا، وہ شرافت کے اس منظر سے لطف لیتے،"

ڈاکٹر صاحب کے سامنے مولانا محمد علی صاحب کا تذکرہ آجاتا تو وہ بھی اُن کا ذکر بڑی
محبت اور عزت سے کرتے، اور مولانا مناظر احسن گیلانی کا جو مرثیہ مولانا محمد علی پر ہے،

اس کا یہ مصرع پڑھ کر ان کو یاد کرتے،

ع عجب مستے عجب دیوانہ بودے

سنہ ۱۹۳۵ء کی اصلاحات کے بعد جب کانگریس نے مرکزی اور صوبائی قانون ساز مجلسوں کے انتخاب میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا، تو ڈاکٹر صاحب بھی ترہت (صوبہ بہار) کے دو حلقوں سے کھڑے ہوئے، اور کامیاب رہے، ان کو اپنے انتخابی حلقہ میں ایسی مقبولیت رہی کہ مسلم لیگ بھی اپنے انتہائی عروج کے زمانہ میں اُن کو شکست نہ دے سکی، جداگانہ اور مخلوط انتخاب دونوں میں وہ سنہ ۱۹۶۵ء تک یہاں سے برابر منتخب ہوتے رہے،

سنہ ۱۹۳۷ء کے انتخاب کے بعد جب بہار میں وزارت بنی تو وہ بھی اس کے ایک رکن تھے، ان کے عقیدت مندوں کا تو خیال تھا کہ وہ اپنی خدمات اور آل انڈیا حیثیت کی بنا پر بہار کے وزیر اعلیٰ بنائے جائیں گے۔ لیکن ان کی جگہ پر سری کرشن سنہا اس عہدۂ جلیلہ پر فائز کئے گئے، اس ناانصافی پر ڈاکٹر صاحب کو اندرونی شکایت تو ضرور پیدا ہوئی ہوگی۔ لیکن اُن کی طبیعت میں جارحیت، جھگڑا فساد، بالکل نہیں تھا، وہ مکدر ضرور ہوتے لیکن اپنے تکدر کا بوجھ خود برداشت کر لیتے، انھوں نے اپنی خانگی زندگی میں بھی غصے اور اشتعال کا اظہار شاید ہی کیا ہو، گھر میں کسی سے اُن کو رنج پہونچتا تو تھوڑی دیر کے لئے خاموش رہ کر پھر خوش ہو جاتے، انھوں نے سری کرشن سنہا کے ساتھ پورا تعاون کیا، اور انکو اپنا بھائی ہی سمجھتے رہے، اور جب ان سے اس ناانصافی کا ذکر کیا جاتا تو وہ کہتے کہ وہ خود اس عہدہ سے سری کرشن کے حق میں دست بردار ہو گئے تھے، اس طرح نکتہ چینیوں کا منھ بند کر دیتے،

وزارت میں اُن کو تعلیم، صنعت، حرفت، تجارت اور زراعت کے محکمے دیئے گئے، وہ پورے اخلاص اور تن دہی سے وزارتی کاموں میں لگ گئے۔ اس زمانہ میں ان محکموں میں جو کچھ ہوا، اُن ہی کی سرگرمیوں کے نتائج کہے جا سکتے ہیں، انھوں نے ابتدائی تعلیم کی طرف زیادہ توجہ کی، اس کے فروغ کے لئے مختلف شہروں میں کمیٹیاں بنائیں، تعلیم کی عام اشاعت کے لئے بھی مختلف جگہوں پر تعلیمی مرکز قائم کئے۔ خود بھی بعض ان پڑھوں کو سڑکوں پر کھڑے ہوکر کچھ پڑھانے کی کوشش کی، اُن کی یہ بھی خواہش تھی کہ مسلمان ہندی، اور ہندو اردو سیکھیں اس کے لئے انھوں نے کچھ اسکیمیں بھی بنائیں مسلمانوں کو ہندی سکھانے کے لئے سولہ[16] صفحے کی ایک کتاب "ہندی پوتھی" کے نام سے شائع کی، جس کی قیمت ایک پیسہ رکھی گئی، مگر اس زمانہ میں مسلمانوں نے اس سے کوئی دلچسپی نہیں لی، بلکہ دربھنگہ میں ایک مسلمان وکیل نے ایک بہت ہی طنز آمیز تقریر کی کہ "کانگرنیس نے ایک کتاب پوتھی چھپوائی ہے مسلمان بچہ بھلا پوتھی پڑھے گا!" ڈاکٹر صاحب اس تقریر کا حوالہ کبھی ہنس کر اور کبھی دکھ کے ساتھ اپنی گفتگو میں برابر دیتے،

انھوں نے اپنی وزارت کے زمانہ میں ہندی اور اردو کو قریب ترلانے کے لئے ایک ہندوستانی کمیٹی بھی بنائی، اس کے اراکین میں ہندوؤں کے ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد، استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی اور ڈاکٹر عبدالحق بھی تھے، اس کمیٹی کے ذریعہ ایسی ملی جلی زبان تیار کرنے کی کوشش کی گئی، جس میں مشترکہ تعلیمی نصاب بن سکے، مگر کچھ ہندوؤں کو یہ شبہ پیدا ہوا کہ اس طرح اردو زبان لاد دی جائے گی، ایک موقع پر جب پٹنہ میں اس کمیٹی کا جلسہ ہورہا تھا، تو انھوں نے اس کے خلاف جلوس نکالا، ایک مقامی انگریزی اخبار میں اس کی تفصیل شائع ہوئی، ڈاکٹر صاحب یہ اخبار پڑھ رہے تھے، تو استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی اُن کے

پاس بیٹھے تھے، ڈاکٹر صاحب جلوس کی تفصیل پڑھ کر بہت آزردہ ہوئے، انھوں نے سید صاحب سے اپنی آزردگی کا اظہار صرف یہ کہکر کیا کہ ان ہندوؤں کو دیکھئے" سید صاحب نے ہنس کر جواب دیا، "آپ دیکھئے میں تو دیکھتا ہی رہتا ہوں" مگر خود سید صاحب کو مسلمانوں کو بھی دیکھنا پڑا، ان ہی کی دعوت پر ڈاکٹر صاحب نے اُن کے وطن دیسنہ کے مشہور کتب خانہ کے ایک جلسہ میں شرکت کرنے کا ایک پروگرام بنایا، سید صاحب کے حکم پر میں نے اُن کے لئے ایک سپاسنامہ لکھا، جس میں محبوب رہنما عزیز قائد، معزز مہمان وغیرہ جیسے الفاظ والقاب لکھکر انکا خیر مقدم کیا، مگر اس کے پیش ہونے سے پہلے جب یہ گاؤں والوں کی نظر سے گذرا تو انھوں نے اُس کی سخت مخالفت کی،" اُن کی دلیل یہ تھی کہ وہ ہندوؤں کے محبوب، عزیز، اور معزز رہنما ہیں، مسلمانوں کے نہیں ہیں، اُن کی شدید مخالفت کی وجہ سے یہ سپاسنامہ پیش نہیں کیا جاسکا، جس سے سید صاحب اور مجھ کو بڑی تکلیف ہوئی، ڈاکٹر صاحب آئے، ایک تقریر کرکے واپس تشریف لے گئے، خدا جانے ہندوؤں اور مسلمانوں کی اس قسم کی مخالفت سے اُن کو کتنا سابقہ پڑا، مگر وہ مجنوں بن کر دونوں لیلاؤں کی خاطر عذاب برداشت کرتے رہے،

ہندوؤں میں ہندوستانی زبان کی مخالفت بڑھی تو ڈاکٹر صاحب نے ایک بہت طویل خط پنڈت جواہر لال نہرو کو لکھا، جس کے جواب میں پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی اپنے دکھ بھرے جذبات کا اظہار کیا، دونوں کی خط وکتابت اخباروں میں شائع ہوئی، مگر ڈاکٹر صاحب کے ساتھ گاندھی جی، پنڈت جواہر لال نہرو، راجندر پرشاد، عبدالحق وغیرہ کی کوششوں کے باوجود ہندوستانی زبان کی تحریک لسانی جھگڑوں میں قتل ہو کر ہمیشہ کے لئے دفن ہوگئی،

ان ہی کی وزارت کے زمانہ میں پٹنہ یونیورسٹی میں اُردو کی پروفیسری کی جگہ نکالی گئی،

اوران ہی کی کوششوں سے بہار کے لوکل بورڈ میں مسلمانوں کی ملازمت کا تناسب طے ہوا جب
یہ باضابطہ تجویز کی شکل میں صوبائی مجلس قانون ساز میں پیش کی جانے والی تھی، تو دوسری جنگ
عظیم چھڑ گئی، کانگریسی وزارت مستعفی ہوگئی، اس کے بعد ہندوستان کو بہت ہی سخت سیاسی بحران
سے گذرنا پڑا، مسلم لیگ نے ایک علیحدہ ریاست کا مطالبہ پاکستان کے نام سے کیا، کانگریس
ہندوستان کو جلد از جلد انگریزوں کی غلامی سے نجات دلانا چاہتی تھی، انگریز اس وقت ہندوستان
کی آزادی اور پاکستان کے قیام کو پس پشت رکھ کر صرف جنگ عظیم جیتنے کی فکر میں تھے اسی
رسہ کشی میں کانگریس نے اگست ۱۹۴۲ء میں انگریزوں کے خلاف "ہندوستان چھوڑو" کی
تجویز پاس کردی، پورے ہندوستان میں ایک ہلچل مچ گئی، کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے تمام
اراکین گرفتار کرلئے گئے۔ ان ہی میں ڈاکٹر صاحب بھی تھے۔ وہ پنڈت جواہر لال نہرو،
مولانا ابوالکلام آزاد، آصف علی، سردار پٹیل، گووند ولبھ پنت، ڈاکٹر پٹا بھی سیتا رامیہ، اچاریہ
کرپلانی، اور ڈاکٹر پروفلا گھوش کے ساتھ احمد نگر کے قلعہ میں محبوس کر دیئے گئے۔

اس جیل خانہ میں اُن کی بعض دلچسپیوں کا حال مولانا ابوالکلام آزاد نے غبار خاطر
میں اپنے قلم کی رعنائیوں کے ساتھ اس طرح لکھا ہے:-

"ایک دن صبح چائے پیتے ہوئے نہیں معلوم سید محمود صاحب کو کیا سوجھی، ایک طشتری
میں تھوڑی سی شکر لے کر نکلے، اور صحن میں جا بجا کچھ ڈھونڈنے لگے،

گوئی ایں طائفہ ایں جا گہرے یافتہ اند

جب اُن کا تعاقب کیا گیا تو معلوم ہوا کہ چیونٹیوں کے بل ڈھونڈھ رہے ہیں، جہاں کوئی سوراخ
دکھائی دیا شکر کی ایک چٹکی ڈال دی، میں نے جو یہ حال دیکھا تو یہ کہکر اُن کے سمند سعی پہ
ایک اور تازیانہ لگا دیا کہ

ولالارض من کاس الکرام نصیب

کہنے لگے اس کا ترجمہ کیجئے، میں نے کہا خواجۂ شیراز مع اضافہ کے کر چکے ہیں:

اگر شراب خوری جرعۂ فشاں بر خاک　　از آں گناہ کہ نفعے رسد بغیر چہ باک

یہاں کمروں کی چھتوں میں گوریاؤں کے جوڑوں نے جا بجا گھونسلے بنا رکھے ہیں، دن بھر اُن کا شور و ہنگامہ برپا رہتا ہے، چند دنوں کے بعد محمود صاحب کو خیال ہوا، ان کی بھی کچھ تواضع کرنی چاہیئے۔ ممکن ہے گوریاؤں کی زبانِ حال نے انھیں توجہ دلائی ہو کہ ع

نگاہِ لطف کے امیدوار ہم بھی ہیں

چھپرہ میں ایک مرتبہ انھوں نے مرغیاں پالی تھیں، دانہ ہاتھ میں لے کر آ۔ آ کرتے تو ہر طرف سے دوڑتی ہوئی چلی آتیں، یہی نسخہ چڑیوں پر بھی آزمانا چاہا۔ لیکن چند دنوں کے بعد تھک کر بیٹھ رہے، کہنے لگے عجیب معاملہ ہے۔ دانہ دکھا کر جتنا پاس جاتا ہوں اتنی ہی تیزی سے بھاگنے لگتی ہیں؛ گویا دانہ کی پیش کش بھی ایک جرم ہوا،

خدایا جذبہ دل کی مگر تاثیر الٹی ہے　　کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

میں نے کہا طلب و نیاز کی راہ میں قدم اٹھایا ہے تو عشوۂ و ناز کی تغافل کیشیوں کے لئے صبر و شکیب پیدا کیجئے۔ نیاز و عشق کے دعووں کے ساتھ نازِ حسن کی گلہ مندیاں زیب نہیں دیتیں،

بہ نازکی نہ بری پے بہ منزلِ مقصود　　مگر طریق روش از مہر نیاز کنی
اگر نیاز بر آید مرد کہ آخر کار　　رصد نیاز بجو آند ترا و ناز کنی

یہاں کبھی کبھی صبح کو جنگلی بیناؤں کے بھی دو تین ...... جوڑے آنکلتے ہیں،

اور اپنی غرر غرر اور چیوچیو کے شور سے کان بہرا کر دیتے ہیں۔ اب محمود صاحب نے گویا یوں
کے عشق پر تو واسوخت پڑھا، مگران آہوان ہوائی کے لئے دامِ ضیافت بچھادیا،

من و آہوے صحرائی کہ دایم می رمید از من

روز صبح روٹی کے چھوٹے ٹکڑے ہاتھ میں لے کر نکل جاتے اور صحن میں جا
کھڑے ہوتے، پھر جہاں تک حلق کام دیتا۔ آ۔ آ۔ کرتے جاتے، اور ٹکڑے فضا کو دکھا
دکھا کر پھینکتے رہتے، یہ صلاے عام مینا ؤں کو تو ملتفت نہ کر سکی، البتہ شہرستانِ ہوا کے
دریوزہ گرانِ ہرجائی یعنی کوؤں نے ہر طرف سے ہجوم شروع کر دیا، میں نے کوؤں کو
شہرستانِ ہوا کا دریوزہ گر اس لئے کہا کہ کبھی انھیں مہمانوں کی طرح کہیں جاتے دیکھا نہیں،
طفیلیوں کے غول میں بہت کم دکھائی پڑے، ہمیشہ اسی عالم میں پایا کہ فقیروں کی طرح
ہر دروازے پر پہنچے، صدائیں لگائیں اور چل دیئے۔

... فقیرانہ آئے صدا کر چلے

بہرحال محمود صاحب آ۔ آ۔ کے تسلسل سے تھک کر جونہی مڑتے، یہ دریوزہ گرانِ
کوتہ آستین فوراً بڑھتے اور اپنی دراز دستیوں سے دسترخوان صاف کر کے رکھ دیتے،

ع اے کوتہ آستیناں، تا کے دراز دستی

صحن کے شمالی کنارے میں نیم کا ایک تناور درخت ہے، اس پر گلہریوں کے
جھنڈ کودتے پھرتے ہیں، انھوں نے جو دیکھا کہ

صلاے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

تو فوراً لبیک لبیک اور مرحمت عالی زیاد کہتے ہوئے اس دسترخوانِ کرم پر ٹوٹ پڑیں

یاراں صلاے عام ست گرمی کنید کارے

کوّوں کی درازدستیوں سے جو کچھ بچتا، ان کوتاہ دستوں کی گلہریوں کا کھاجا بن جاتا، پہلے روٹی کے ٹکڑوں پر منہ مارتیں پھر فوراً گردن اٹھالیتیں۔ ٹکڑا چبا جاتیں اور سر ہلا ہلا کر کچھ اشارے بھی کرتی جاتیں۔ محمود صاحب کو دادِ ضیافت دیتے ہوئے بہ طریقِ حسن طلب یہ بھی کہتی جاتیں کہ

گرچہ خوب است ولیکن قدرے بہتر ازیں

خیر بیچاری گلہریوں کا شمار تو اُس سفرۂ کرم کے ریزہ چینوں میں ہوا، لیکن کوّے جنھیں طفیلی سمجھ کر میزبانِ عالی ہمت نے چنداں تعرض نہیں کیا تھا اب تک اس قدر بڑھ گئے کہ معلوم ہونے لگا کہ پورے احمد نگر کو اس بخششِ عام کی خبر مل گئی ہے، ....

آخر ان سے کہنا پڑا کہ اگر آپ کے دستِ کرم کی بخششیں رُک نہیں سکتیں، تو کم از کم چند دنوں کے لئے ملتوی ہی کر دیجئے، .... ابھی محمود صاحب اس درخواست پر غور کر ہی رہے تھے کہ ایک دوسرا واقعہ ظہور میں آگیا، ایک دن صبح کیا دیکھتے ہیں کہ چھت کی منڈیر پر دو معمر و سنّ رسیدہ گدھ بھی تشریف لائے ہیں،

پیری سے کمر میں اک ذرا خم   توقیر کی صورتِ مُجسّم

اور گردن اٹھائے صلائے سفرہ کے منتظر ہیں،

اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی

معلوم ہوتا ہے ان ناخواندہ مہمانوں کی آمد محمود صاحب پر بھی با این ہمہ جود و سخائے عام گراں گزری، کہنے لگے، بزرگوں نے کہا ہے گدھوں کا آنا منحوس ہوتا ہے، بہرحال ان حضرات کے بارے میں بزرگانِ سلف کا کچھ ہی خیال رہا ہو، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کی تشریف آوری ہمارے لئے تو بڑی ہی بابرکت ثابت ہوئی، کیونکہ ادھر ان کا

مُبارک قدم آیا ادھر محمود صاحب نے ہمیشہ کے لئے اپنا سفرۂ کرم لپیٹنا شروع کر دیا"
ممکن ہی مولانا ابوالکلام آزاد کے مکتوب کے اس طویل اقتباس کو ناظرین اس مضمون میں غیر ضروری سمجھیں لیکن راقم کو اس میں ڈاکٹر صاحب کی سیاسی اور ذاتی زندگی کی پوری جھلک نظر آتی ہے، انھوں نے اپنے وطنی اور ملی جذبات کا ایک خوان تیار کیا تھا، اُس کی طرف آ۔آ۔کر کے لوگوں کو بُلاتے رہے، مگر اُن کے جذبۂ دل کی تاثیر الٹی رہی، انھوں نے لوگوں کو جتنا اپنی طرف کھینچا، اتنا ہی وہ اُن سے کھنچتے چلے گئے، وہ اس طلب و نیاز کی راہ میں دوسروں کے عشوہ و ناز کی تغافل کیشیوں کو بہت ہی صبر و شکیب کے ساتھ برداشت کرتے رہے، بہت کم بہرہ مند ہوئے، مگر یارانِ نکتہ داں کے لئے صلائے عام ضرور بنے رہے، اُن کی سیاسی اور نجی زندگی میں اُن کے ساتھ اچھے چھوٹے، اُن کے سفرۂ کرم پروردِ ضیافت دینے، لمبے ہاتھ بڑھانے والے اور گردن اٹھا کر صلائے سفرہ کے انتظار کرنے والے بھی رہے، انھوں نے سب کے ساتھ نباہنے کی کوشش کی اور جن سے نہ نبھ سکی اُن سے اُلجھے نہیں بلکہ یہ کہکر اُن سے علٰحدہ ہو گئے ع میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے
یہی اُن کی سیاسی زندگی کا حاصل رہا،

انھوں نے اس جیل خانہ میں اپنے پسندیدہ اشعار کا ایک مجموعہ بھی تیار کیا تھا، جو ۱۹۴۹ء میں نظامی پریس بدایوں سے ارمغانِ آلام کے نام سے شائع ہوا، اس کے مقدمہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ارمغانِ آلام کا تاریخی نام مولانا ابوالکلام آزاد نے رکھا تھا، جس سے ۱۳۶۳ھ نکلتا ہے، اس میں فارسی شعراء میں مولانا روم، دقیقی، سعدی، حافظ، شرف جہاں، نظیری، حسن، جامی، اوحدی، عطار، عراقی، خسرو، عرفی، فغانی، سلطان ابوسعید ابوالخیر، ابن یمین، وغیرہ کے کلام کا انتخاب ہے، پھر اُردو شعراء میں اقبال، غالب، آتش، انیس

شاد عظیم آبادی، درد، سوز، ذوق، میرزا داغ، سالک، وزیر، شیفتہ، مولانا محمد علی، سودا، حالی، ریاض، جرأت، اکبر، مصحفی وغیرہ کے اشعار ہیں، آسی غازی پوری کا کلام تو کثرت سے ہے، انتخاب میں کوئی ترتیب نہیں رکھی گئی ہے، جب جو اشعار پسند آگئے ہیں لکھتے چلے گئے ہیں، کبیر کے کچھ ہندی اشعار بھی ہیں، حسب ذیل دو ہندی اشعار کے نیچے "محمود" لکھا ہے،

نہ آج کل تھیں پرم پیا کا ہماری من مین کیا ہے ٹھارا
سکھی ازل سیں رہے ہیں لکھا لو ہیں پیا کا پیا ہمارا

دُکاں کہیں پتھر سے کچھ سخت نہیں ہے دیکن — جو کوئی پیا سے بچھڑا وہ سخت ہے پتھر سے
محمود تجھ میں دستا پورا ہنر وفا کا — ہے کیا عجب بھاوے توں پیر کو اس جہر سے

معلوم نہیں یہ "محمود" کون شاعر ہے، کہیں ایسا تو نہیں کہ انھوں نے خود طبع آزمائی کی ہو، مگر کبھی اپنی شعر گوئی کا ذکر نہیں کیا، شروع میں کہیں کہیں بعض اشعار کی تشریح بھی کی ہے، جن میں اثبات باری تعالیٰ، فنا و بقا، سزا و جزا کی منزل، موجوداتِ عالم، وحدتِ وجود، ترکِ خودی، اختلاف مذاہب، جبر و قدر پر ان کے کچھ خیالات بھی ہیں، یہ اشعار ڈاکٹر صاحب کے داغہائے سینہ کی حیثیت رکھتے ہیں، شعروں کے انتخاب نے اُن کو رسوا تو نہیں کیا، لیکن ان کے دل کے معاملہ کو کھول کر رکھدیا ہے، اس کے شروع میں احید الدین نظامی نے لکھا ہے کہ یہ کتابچہ ڈاکٹر صاحب موصوف کی وسعت معلومات، عالمانہ خیالات، پاکیزگی جذبات اور درد مندانہ محسوسات کا آئینہ دار ہے۔ اس میں جناب عبد الملک آروی مرحوم کا ایک طویل مقدمہ بھی ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ بیاض دیکھنے سے پہلے ہمیں خود اس قدر احساس نہ تھا، کہ ڈاکٹر صاحب کا مذاق شعر و ادب اس قدر ستھرا لطیف اور دل آویز ہے،......

اس بیاض میں بہت سے شعر ہیں جو ڈاکٹر صاحب کی نظر کی گہرائی، ذوق کی بلندی اور

علاوہ نفس پر دلالت کرتے ہیں،

ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب کو اپنی رفیقۂ حیات کے نام سے جن الفاظ میں معنون کیا ہے وہ بھی یہاں پر اس لئے پیش کیے جارہے ہیں تاکہ ان کی ازدواجی زندگی کی ایک جھلک بھی ناظرین کے سامنے آجائے،

بجن کے دیندارانہ تاثرات نے مادی دنیا کی آسائیشوں سے بلند تر روحانی فضا سے مجھکو بہرہ مند کیا، جن کے اخلاقی جمال نے میرے چشمہائے قلب و دماغ کو روشن تر بنایا، جن کے صبر و سکون نے قید و محن کی سختیاں مجھ پر آسان کر دیں، یہ نگارستان سخن کی گلچینیاں جو خلوت خانۂ زنداں کی یادگار و ہمراز ہیں، محرم راز حیات کی حسن خدمت میں قید محمود کے مشاغل جمیلہ کی توضیح و تشریح کی غرض سے پیش کی جاتی ہیں،

چوں نہ یابم محرم راز دگر — تا شود با من شریک خشک و تر
چیدہ ام ایں گلشن پارینہ را — تازہ وارم داغہائے سینہ را

ڈاکٹر صاحب احمدنگر کے قلعہ سے اپنے ساتھیوں سے پہلے رہا کر دیئے گئے، وہاں سے انھوں نے اس زمانہ کے وائسرائے لارڈ ویول کو ایک خط لکھا تھا، جو عام اخبارات میں شائع ہوا، اس کی اشاعت سے ڈاکٹر صاحب پر یہ الزام آیا کہ انھوں نے معافی مانگ کر قید سے رہائی حاصل کر لی، دارالمصنفین کی نجی صحبتوں میں کئی بار اس مسئلہ کا ذکر آیا، انھوں نے فرمایا کہ معافی مانگنے کی میری نیت ہرگز نہ تھی، بلکہ میں شروع سے اس کا قائل تھا کہ انگریز دن کو کوئی بات اچھی طرح سمجھائی جائے، تو وہ سمجھنے کی کوشش کرکے کسی اچھے نتیجہ پر پہنچتے ہیں، انھوں نے اسی سلسلہ میں یہ بیان کیا کہ ایک بار وہ لارڈ

لن لتھگو سے وائسرگیل لاج میں ملے تھے، تو اُن کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ وہ گاندھی جی کے متعلق تو اچھی رائے رکھتے ہیں، مگر پنڈت جواہر لال نہرو کو بالکل اچھا نہیں سمجھتے ہیں اور وہ اُن کے سخت مخالف ہیں، لیکن ڈاکٹر صاحب نے ان کو پنڈت جی کی بہت سی خوبیاں بتائیں تو انھوں نے غور سے سُنا، پھر اُن کے متعلق ان کی رائے کچھ بدلتی نظر آئی، لارڈ ویول کو خط لکھنے میں ڈاکٹر صاحب کی یہی نیت کارفرما ہی، میں نے اُن سے عرض کیا کہ جہاں تک مجھ کو یاد ہے، اس خط میں آپ نے "ہندوستان چھوڑ دو" کی تجویز سے اپنی مخالفت کا اظہار کیا تھا، اس سے غلط فہمی پیدا ہوئی، اس کے جواب میں فرمایا کہ میں بے شک اس تجویز کا مخالف تھا، میرا خیال تھا کہ جب اس عالمگیر جنگ میں انگریزوں کے سامنے ان کی زندگی اور موت کا سوال ہے تو ہم کو نرم اور شریفانہ رویہ اختیار کرنا چاہیے تاکہ ہمارے اس رویہ سے متاثر ہو کر وہ ہم کو جلد از جلد آزادی دے سکیں، انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ نہ صرف وہ بلکہ خود مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو اس تجویز کے مخالف تھے، ڈاکٹر صاحب کی اس گفتگو کی تائید ڈاکٹر راجندر پرشاد کی کتاب "باپو کے قدموں میں" (اردو ترجمہ ص ۲۳۰) اور مولانا ابوالکلام آزاد کی انڈیا ونس فریڈم سے بھی ہوتی ہے، (ص) یہ تجویز گاندھی جی کی تھی، اور وہ اس کے منظور کرانے پر مصر تھے، ان کی مخلصانہ قیادت کی وجہ سے کسی نے اُن سے اختلاف کرنا پسند نہیں کیا، اور تجویز منظور ہو گئی، ڈاکٹر صاحب کو خود گاندھی جی سے بڑی عقیدت تھی، اسی لئے مذکورۂ بالا تجویز سے اختلاف کے باوجود اُن کا یہی خیال تھا کہ انہی کے پیچھے چل کر ملک کی آزادی حاصل کی جا سکتی ہے، انھوں نے انگریزوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اگر گاندھی جی کی زندگی میں ہندوستان کو آزادی مل گئی تو برطانیہ کے ساتھ ہندوستان کے تعلقات ہمیشہ اچھے رہیں گے، ورنہ آگے چل کر

انتہا پسندوں کے ہاتھوں میں آزادی کی جنگ کی قیادت آگئی تو ہندوستان میں برطانیہ کا کوئی مستقبل نہیں ہوگا، اسی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے انھوں نے لارڈ ویول کو وہ خط لکھا، اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب کے خیالات اور جذبات کی وضاحت اُن کے اس انٹرویو سے زیادہ ہو جائے گی، جو نیض آباد کے رسالہ دوام میں شائع ہوا تھا،

"دراصل اس واقعہ کی اصلیت یہ ہے کہ میں نے جیل میں لارڈ ویول کے لئے ایک خط ڈرافٹ کیا، اور یہ لکھا کہ اگر گاندھی جی کی زندگی میں ہندوستان سے صلح کرلو تو بہتر ہے ورنہ اُن کے بعد ہندوستان سے تمہارے تعلقات بہت خراب ہو جائیں گے، اور یہاں سے کبھی تجارت نہ کر سکو گے، اس لئے گاندھی جی کی زندگی میں ہندوستان کو آزادی سے ہمکنار کردو، مجھے یہ اندازہ تھا کہ جنگ کے بعد لازماً انگریز ملک کو آزاد کر دیں گے، خود چرچل نے بار ہا لکھا تھا کہ لڑائی کے بعد ڈومینین اسٹیٹس کا ایک اور ملک ہو جائے گا، میں چرچل کے مزاج سے واقف تھا، چرچل کا باپ مسٹر بلنٹ کا دوست تھا، وہ کہتے تھے کہ چرچل اسلام اور ہندوستان دونوں کا دشمن ہے، چرچل سے میری ملاقات بھی انگلینڈ میں ہوئی تھی، اور تعارف بھی تھا، میں نے اس خط میں اس بات کا بھی ذکر کر دیا، اس تفصیلی خط میں کہیں استعفے کا لفظ آگیا تھا، میں نے یہ خط لکھ تو دیا مگر بھیجنے کا ارادہ نہیں تھا، مگر میں نے قرآن سے فال نکالی، پانچ دن برابر وہی جگہ نکلتی رہی، جہاں فرعون نے عزیز مصر کو جیل سے بلا کر سلطنت سونپی تھی، چنانچہ میں نے خط بھیج دیا، ویول نے خط پاتے ہی اسے ہوم ڈپارٹمنٹ کو بھیج دیا، حالانکہ وہ ذاتی طور پر اُن کے نام تھا، چنانچہ حکم آیا، کہ مجھے چھوڑ دیا جائے، اس پر میری موافقت اور مخالفت میں بڑا شور ہوا، گاندھی جی نے میری موافقت میں خط لکھا کہ یہ نقط ایک بے احتیاطی ہے، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں It is nothing more than a political indiscretion.

بہت سے اخباروں نے میرے خط کی تعریف کی اور موافقت میں لکھا، مجھے تسلیم ہے کہ میں ایک بڑا سیاست داں نہیں تھا، بلکہ ایک مخلص کارکن تھا۔"

رہائی کے بعد کئی مہینے تک گاندھی جی کے ساتھ واردھا کے آشرم میں رہے، اس زمانہ میں ہندوستان کی آزادی کی لڑائی اپنے عروج تک پہونچ گئی تھی۔ انگریز دوسری جنگِ عظیم جیت رہے تھے، وہ ہندوستان کو آزاد کرنے کے لئے بھی طے کر چکے تھے، مگر انڈین نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ میں اختلاف بڑھتا جارہا تھا، کانگریس متحدہ ہندوستان کے لئے مصر تھی، لیکن مسلم لیگ مسلمانوں کی اکثریت کے علاقے کے لئے ایک علحدہ ریاست قائم کرنے پر زور دے رہی تھی، ہندوستان کی سیاست برطانوی حکومت، کانگریس اور مسلم لیگ کی کشمکش میں ایک مثلث بن گئی تھی، ان تمام سیاسی گتھیوں، پیچیدگیوں اور تلخیوں میں ڈاکٹر صاحب کانگریس کے ہمنوا رہے، ۱۹۴۵ء میں عام انتخاب ہوا، تو جداگانہ انتخاب کی وجہ سے مسلمانوں کے حلقے میں مسلم لیگ کا پلہ بھاری رہا، لیکن وہ ڈاکٹر صاحب کو اُن کے حلقۂ انتخاب میں نہ ہرا سکی، بہار میں صوبائی وزارت بنی، تو ڈاکٹر صاحب بھی اس میں محکمۂ ترقیات اور رسل و رسائل کے وزیر کی حیثیت سے شریک کئے گئے، لیکن اس پُر آشوب زمانہ میں وہ اپنی وزارت سے کسی طرح خوش نہیں رہے، کانگریس اور مسلم لیگ کی کشمکش کی وجہ سے پورے ملک کی سیاسی فضا مکدر تھی، اسی کی وجہ سے جابجا فرقہ وارانہ فسادات ہونے لگے۔ نواکھالی میں ایک زبردست فساد ہوا، اس کے بعد ہی پورے بہار میں اس سے زیادہ ہولناک بلوے ہوئے، ڈاکٹر صاحب ان فسادات کا ذکر کرتے تو اُن کی باتوں میں بڑا دکھ اور درد پایا جاتا، اس سلسلہ کی کہانی اُن ہی کی زبانی سنئے،

"اچاریہ کرپلانی اس زمانہ میں کانگریس کے صدر تھے، انھوں نے نواکھالی کے بلوے

کے متعلق بیان دیدیا، کہ نواکھالی میں پچاس ہزار ہندو مارے گئے، حالانکہ چند سو سے زیادہ ہلاک نہیں ہوئے تھے، کرپلانی کے بیان کا سخت ردِ عمل ہوا، ہندوؤں میں زبردست ری ایکشن ہوا، مسلمان بری طرح مارے جانے لگے، پورے بہار و بنگال و بہار کی فضا خراب ہو گئی، پٹنہ میں جواہر لال نہرو آئے، میٹنگ ہوئی، میں اس میں جواہر لال کے سامنے بیٹھا، چیف منسٹر نے کہا تین چار سو آدمی ہلاک ہوئے، جواہر لال نے مجھ سے پوچھا تو میں نے کہا کم از کم پانچ ہزار آدمی مارے گئے، کچھ مسلمان پٹنہ کے اسلامیہ ہال میں جمع ہوئے، شور و غل کیا کہ ہائے مارے گئے، ہائے کیا ہوا، لیاقت علی خاں نے بعد کو انھیں ڈانٹا یہ سب کیا کر رہے ہو، رونے پیٹنے سے تم اپنی حفاظت نہیں کر سکتے، اصل میں اس بلوہ میں یہ ہوا کہ کچھ لوکل لیڈروں نے مسلمانوں کو ورغلایا، کہ بھاگو یہاں سے بنگال جا کر بس جاؤ، ورنہ جان کی خیر نہیں ہے، اسی بھگدڑ میں اُن کے جان و مال کی زبردست تباہی ہوئی، ...... گاندھی جی اس وقت نواکھالی میں تھے، ...... ان کا خط میرے پاس آیا کہ تم آؤ اور مجھے صورتِ حال کی صحیح اطلاع دو، جواہر لال پٹنہ آئے ہوئے تھے، سرکٹ ہاؤس میں ٹھہرے تھے، ان سے گاندھی جی نے فون پر بات کی، انھوں نے اُن سے کہا کہ محمود کا خط آیا ہے کہ آیئے، چنانچہ میں آنا چاہتا ہوں، پنڈت جی نے کہا مت آیئے، انھوں نے گاندھی سے یہ بھی کہا کہ یہاں کے حالات درست کرنے کے لئے ہم کو فائرنگ بھی کرنا پڑے، پنڈت نہرو نے بلوہ کی آگ فرو کرنے کی پوری جد و جہد کی، ہم لوگ چیف منسٹر کے ساتھ جیپ میں مختلف علاقوں میں جاتے تھے، لوگوں کو سمجھاتے تھے، بالآخر پٹنہ میں فائرنگ تک کی نوبت آ گئی اس پر لوگوں نے پنڈت جی کی سخت مخالفت کی، گاندھی جی کو یقین نہیں ہو رہا تھا، کہ انھیں صحیح اطلاعات پہونچ رہی ہیں، انھوں نے مجھے پانچ خطوط لکھے کہ تم آؤ۔ اور مجھے حالات کے بارے میں مطلع کرو، ان دنوں خون خرابا، اور

قتل و غارتگری کے چشم دید مناظر سے میں بے حد متاثر تھا، چیف منسٹر کے ساتھ رانچی جاتے ہوئے، اپنی آنکھوں سے جلتے ہوئے گاؤں اور مکانوں کی چھت پر مظلوموں کی چیخ و پکار کا عالم دیکھا، رانچی ہم اس لئے گئے تھے، کہ انگریز فوجی جنرل سے فوج بھیجنے کے بارے میں گفتگو کی جائے، جنرل نے بڑی حقارت سے گفتگو کی جس سے بڑا صدمہ ہوا، میں نے گاندھی جی کو اپنا مفصل اور تاریخی خط لکھا اور چشم دید صحیح واقعات کی تفصیل سے انھیں مطلع کیا، یہ اپنے خاص آدمی کے ہاتھ اُن کو بھجوایا، مجھے معلوم ہوا کہ میری تحریر سے گاندھی جی بے حد متاثر ہوئے، خط سنتے جاتے تھے، اور روتے جاتے تھے، اور یہ کہتے تھے کہ ...... محمود نے مجھے دھوکا دیا، حالات سے بے خبر رکھا، .... بلوہ اگرچہ دب چکا تھا، مگر گاندھی جی میرے خط کے بعد فوراً بہار آنے کے لئے تیار ہو گئے، مسٹر کرپلانی وغیرہ نے انھیں یہ مشورہ دیا کہ وہ نہ آئیں، صوبہ کے لیڈروں نے بھی فون پر فون کیا، کہ وہ نہ آئیں، مگر گاندھی جی کسی کے کہنے سننے سے اپنے ارادے سے باز نہ آئے، اور پٹنہ کے لئے چل کھڑے ہوئے، کلکتہ آکر مجھے تار دیا کہ میں تمھارے یہاں ٹھہروں گا، بہار کے منسٹر چاہتے تھے کہ وہ میرے یہاں نہ ٹھہریں، وہ میرے پاس آئے اور کہا کہ باپو کو آپ کے پاس تکلیف ہوگی، آشرم میں انھیں آرام رہے گا، انھوں نے گاندھی جی کو پھر فون کیا، مگر انھوں نے ڈانٹ دیا، وہ آئے اور میرے یہاں قیام پذیر ہوئے، میں نے اپنے کمپاونڈ میں خیمے لگوا دیئے تھے، میرے ساتھی مجھ سے خفا تھے، کہ میں نے کیبنٹ کے اصولوں کے خلاف کام کیا، میں نے انھیں بتایا کہ گاندھی جی کے پانچ خطوط آتے، تب میں نے ان کو جواب لکھا،

(بحوالہ رسالہ دوام، مئی ۱۹۷۱ء)

کانگریس اور مسلم لیگ کا اختلاف بڑھتا گیا، ملک کی فضا بھی زیادہ مکدر ہوتی گئی، لارڈ ویول نے کانگریس اور مسلم لیگ کے رہنماؤں کو شملہ کانفرنس میں بلا کر ایک دوسرے سے

قریب تر کرنے کی کوشش کی، مسٹر اسٹیفورڈ کرپس کی سربراہی میں برطانوی کیبنٹ کا مشن آیا، ہندوستان کو تین حلقوں میں تقسیم کر کے ایک وفاقی حکومت کی تجویز پیش کی گئی، ایک دستور ساز اسمبلی کی بھی تشکیل ہوئی، لیکن کانگریس اور لیگ کا اختلاف بڑھا تو یہ دستور ساز اسمبلی کالعدم ہو گئی، کلکتہ میں ہندو مسلمانوں کا زبردست فساد برپا ہوا، مرکز میں کانگریس، اور مسلم لیگ کی عبوری حکومت بن کر قائم تھی، لیکن ملک کی سیاسی حالت بدتر سے بدتر ہوتی گئی، آخر میں ہندوستان کی تقسیم ہو کر رہی، پاکستان کی ایک علحدہ ریاست بن گئی، ان تمام سیاسی ہنگاموں میں ڈاکٹر صاحب کانگریس کے ہمنوار ہے، وہ آخر آخر وقت تک تقسیم کے مخالف رہے، ان کو اپنے کانگریسی ساتھیوں سے شکایت رہی، کہ وہ اس تقسیم پر کیسے راضی ہو گئے، اس موضوع پر گفتگو آتی تو کہتے کہ کانگریسی لیڈر جیل جاتے جاتے تھک گئے تھے، ان کو صوبوں میں حکومت واقتدار کا مزہ بھی ملنے لگا تھا، اس لئے ان کو مرکزی حکومت پر قبضہ پالینے کی عجلت تھی، پھر جاں اور اسباب بتاتے، وہاں یہ بھی کہتے کہ لارڈ ماونٹ بیٹن ایک بہت ہی ہوشیار وائسرائے تھا، اس نے آخر میں کانگریسی رہنماؤں کو سمجھایا کہ پاکستان بننے دیا جائے، زیادہ دنوں تک چل نہیں سکتا، کیونکہ جو فوج پاکستان والوں کو ملے گی، وہ ایک ملک کو باقی رکھنے کے لئے کافی نہ ہوگی، اور جو ملک اُن کو ملے گا، وہ ایک بڑی فوج رکھنے کے لئے کافی نہ ہوگا، ڈاکٹر صاحب برابر کہتے کہ تمام کانگریسی رہنماؤں کا یہی خیال رہا کہ پاکستان زیادہ دنوں تک چل نہیں سکتا ہے اسے ہندوستان کے آگے جھکنا پڑے گا، اس سلسلہ میں انھوں نے فرمایا کہ تقسیم کے بعد ہی حکومت ہند کی طرف سے اعلان ہوا کہ ہندوستان کے وہ تمام بنک جو پاکستان میں ہیں وہاں سے سارا کاروبار سمیٹ کر اپنا سرمایہ ہندوستان منتقل کر دیں، یہ اعلان ڈاکٹر صاحب کو پسند نہیں آیا، ان کا خیال تھا

کہ پاکستان کے پاس سرمایہ تو ہے نہیں، وہ لامحالہ ہندوستان کے بینک سے قرض لے گا، اس طرح وہ ہندوستان کے بینکوں کا مقروض رہ کر ہندوستان ہی کا مرہون رہے گا، ورنہ وہ بیرونی بینکوں کی طرف رجوع کرے گا، اور بیرونی ملکوں کی گود میں چلا جائے گا، ان ہی دنوں وہ پٹنہ سے دلی آئے، اس مسئلہ پر انھوں نے سردار پٹیل سے گفتگو کرنی چاہی، وہ ان کی کوٹھی پر گئے، وہاں وہ نہ ملے، تو پارلیمنٹ ہاوس گئے، جہاں کی گیلری میں سردار پٹیل آتے دکھائی دیئے، وہیں ڈاکٹر صاحب نے اپنی دل کی خلش بیان کر دی، مگر ڈاکٹر پٹیل نے ڈاکٹر صاحب کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا" ڈاکٹر! ابھی دیکھو کیا ہوتا ہے" ہندوستان کے بینک کا کاروبار پاکستان میں بند ہو جائے گا، تو پاکستان سرمایہ حاصل کرنے کی پریشانی میں مبتلا ہو جائے گا۔ دیکھو پاکستان کتنے دنوں تک چلتا ہے، ڈاکٹر صاحب کے اس بیان کی تصدیق مولانا ابوالکلام آزاد کی حسب ذیل تحریر سے بھی کیجا سکتی ہے،

"سردار پٹیل کو یقین تھا کہ پاکستان کی نئی ریاست پنپنے والی نہیں، اور قائم نہیں رہ سکتی، ان کا خیال تھا کہ پاکستان کو منظور کر لینے سے مسلم لیگ کو ایک تلخ سبق دیا جا سکتا ہے۔ پاکستان تھوڑی مدت ہی میں ختم ہو جائے گا، اور وہ صوبے جو ہندوستان سے علیحدہ ہو گئے ہیں، ناقابل بیان مشکل اور مصیبت میں مبتلا ہو جائینگے"

(انڈیا ونس فریڈم ص ۲۰۷)

تقسیم کے بعد ہی ہندوستان اور پاکستان دونوں طرف بڑے خونریز اور ہولناک فرقہ دارانہ فسادات ہوئے، ہندوستان میں گاندھی جی اور پنڈت جواہرلال نہرو کی انتھک کوششوں کے باوجود یہ خونریزی اور ہولناکی نہ رکی، یہاں تک کہ گاندھی جی بھی ایک سفاک کے ہاتھوں گولی کا نشانہ بن کر رام ہو گئے، ڈاکٹر صاحب کو ان خونی واقعات سے بڑا دکھ پہنچا،

علمی سرگرمیاں ناکام ہورہی تھیں، اس لئے انھوں نے اپنی قلمی کاوشوں کا سہارا لیا، اسٹیٹسمین میں ایک مضمون (Hidu Muslim cultural Corcond) "ہندو مسلمان کی ثقافتی یگانگت" کے عنوان سے کئی قسطوں میں لکھا، جو ۱۹۴۹ء میں بمبئی کے ایک ناشر وورا اینڈ کو پبلشر لمیٹیڈ نے ایک کتاب کی صورت میں شائع کیا، اس میں اُن کے وطنی جذبات پورے طور سے ابھرے ہیں، اس میں انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے دلوں میں ہندوستان کی محبت پیدا کرنے کی خاطر یہ دکھایا کہ شروع سے مسلمانوں نے ہندوستان کو بڑی عزت کی نظر سے دیکھا ہے، مثلاً حضرت علیؓ نے فرمایا کہ وہ سرزمین جہاں سب سے پہلے کتابیں لکھی گئیں، اور جہاں سے دانش اور علم کا سرچشمہ بہا وہ ہندوستان ہے۔ حضرت عمرؓ کا قول تھا کہ ہندوستانی دریا میں موتی ہیں، اس کے پہاڑ لعل ہیں، اور اس کے درخت عطر ہیں، پھر عربوں کی تحریروں اور روایتوں سے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ (۱) دنیا کا پہلا انسان اور اللہ تعالیٰ کا پہلا خلیفہ ہندوستان میں آیا، اور یہیں سپرد خاک ہوا، اس لئے اس سرزمین کو انسانیت کا پہلا دارالحکومت کہا جاسکتا ہے، (۲) پہلا انسان خدا کا پہلا پیغمبر تھا، اس لئے ہندوستان کو یہ عزت حاصل ہوئی کہ دنیا کا پہلا پیغمبر اسی سرزمین پر نازل ہوا، (۳) روح القدس یعنی حضرت جبرئیلؑ حضرت آدمؑ کے پاس ضرور آئے ہوں گے۔ اس لئے ہندوستان ہی کو خدا کے پہلے پیام کو جاننے کا فخر حاصل ہوا، (۴) خداوند تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو اس جگہ کی مٹی سے بنایا جس کا نام دگنی تھا، دگنی کے بارے میں وثوق کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ یہ ہندوستان ہی میں ہے، (۵) رسول اللہ صلعم کے چچازاد بھائی ابن عباسؓ کا قول ہے کہ ہندوستان ہی کی سرزمین میں دنیا کے مستقبل کی انسانیت سے یزدانیت کو تسلیم کرنے کے لئے عہد لیا گیا، (۶) حضرت جبرئیلؑ نے حضرت آدمؑ کو بشارت دی کہ انھی ہی کی اولاد میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم،

پیدا ہوں گے۔ اسی طرح اسی سرزمین میں آپ کی پیشینگوئی ہوئی، (۷) ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت آدمؑ بہشت سے حجر اسود ساتھ لائے جس کو وہ مکہ معظمہ لے گئے، اس طرح حجر اسود پہلے ہندوستان کی سرزمین ہی پہ لایا گیا، (۸) ابوموسیٰ اشعریؓ اور مسلمان مورخین کی روایت ہے کہ حضرت آدمؑ کو بہت سی صنعت و حرفت سکھا دی گئی تھی، اس طرح ہندوستان صنعت و حرفت کا پہلا مرکز قرار دیا جا سکتا ہے، (۹) ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت آدمؑ نے ہندوستان ہی میں وفات پائی، ان کا مزار کشمیر میں ہے، (۱۰) ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت نوحؑ کی کشتی ہندوستان میں بھی آئی، اسی لئے یہ طوفانِ نوح سے محفوظ رہا،

ڈاکٹر صاحب یہ تمام باتیں لکھ کر کہتے ہیں کہ ان روایتوں کی صحت و عدم صحت پر بحث کی جا سکتی ہے، لیکن ان سے اتنا ثابت ضرور ہوتا ہے کہ مسلمان شروع سے ہندوستان کو عزت کی نظر سے دیکھتے رہے، اس کے بعد وہ اُن عرب مورخوں مصنفوں اور سیاحوں مثلاً مسعودی بزرگ بن شہریار، سلیمان تاجر، ابن حوقل، الجاحظ اور ان کے ساتھ البیرونی کے حوالے بھی دیتے ہیں جنھوں نے ہندوستان کی تعریف دل کھول کر کی ہے۔ پھر ہندی کے مسلمان شعراء مسعود، قطب علی، اکرم فیض، خسرو، داؤد، ملک محمد جائسی، عبدالرحیم خانخاناں، قطبن، نور محمد، قاسم، قادر، ظاہر، رسخان کا بھی ذکر کرتے ہیں، جنھوں نے اپنی رواداری میں ہندی زبان کو مالامال کیا، اس کے بعد ایک مستقل باب میں یہ دکھاتے ہیں کہ ہندو مسلمانوں کے میل جول سے ایک بہت ہی عمدہ تمدن ظہور میں آیا، جس کا رُخ انگریزوں نے اپنی شاطرانہ حکمت عملی سے اس طرح موڑنے کی کوشش کی کہ ہندو اور مسلمان دونوں سمجھنے لگے کہ اُن کا تمدن علیحدہ علیحدہ ہے، اس میں وہ کامیاب ہوئے، پھر ایک اور باب میں انھوں نے یہ ثابت

ہے مسلمان

کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہندو مسلمانوں کے اتحاد میں مذہب رکاوٹ نہیں بن سکتا ہے مسلمان بت پرستی پسند نہیں کرتے، ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس ناپسندیدگی کو مرزا مظہر جانجاناں کی ایک تحریر سے دور کرنے کی کوشش کی ہے، جن کا خیال تھا کہ ایام جاہلیت کے عربوں اور ہندوؤں کی بت پرستی میں فرق یہ ہے کہ اول الذکر بتوں کو ذاتِ الٰہی کی طرح متصرف و موثر بالذات سمجھتے رہے، لیکن ہندو اپنے بتوں کے تصرف کو ان کا تصرف نہیں بلکہ تصرف الٰہی سمجھتے ہیں۔

اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب کے ملی جذبات بھی پائے جاتے ہیں، ان کے ملنے والوں میں ہر قسم کے خیالات کے اشخاص تھے، شاید اُن کے کانوں میں یہ بات اعتراض کے طور پر پڑی ہوگی کہ مسلمان ہندوستان فتح و تسخیر کے جذبے سے آئے، اس لئے وہ یہاں کی سرزمین پر غاصب بن کر رہے ہیں، اور پھر اُن کی فتح و تسخیر کے خونین واقعات کا ذکر بھی اُن کے سامنے آتا ہوگا، اسی لئے اپنے اس مقالہ کی ابتدا ہی میں لکھا کہ مسلمان جب ہندوستان آئے، تو اس وقت دنیا کا شاید ہی کوئی ایسا ملک رہا ہو جہاں فتح و تسخیر کا سلسلہ جاری نہ رہا ہو، اس لئے اس زمانہ میں فتح و تسخیر صرف مسلمانوں ہی نے نہیں کی، اس کے بعد وہ یہ لکھتے ہیں کہ اس دور کے فاتحین کے مقابلہ میں مسلمان فاتحوں کی ہولناکی اور خونریزی زیادہ قابلِ مذمت نہیں، مثلاً یورپ میں چارلس اعظم نے اپنی سلطنت کا دائرہ سیکسن، ایوارڈ لمبارڈ، وسطی یورپ کے جرمن قبائل، اور شمالی اٹلی کو زیرنگیں کر کے بڑھایا، اس نے اپنے حوصلے کی تکمیل مذہب کی تبلیغ کے نام پر کی، وہ اپنی کامرانی کو عیسائی مذہب کی فتح سمجھتا رہا، جو کوئی گرجا کی بے حرمتی کرتا۔ یا اس میں آگ لگانے کی کوشش کرتا۔ اس کو وہ موت کی سزا دیتا۔ اور جو کوئی عیسائی مذہب قبول نہ کرتا اس کو بھی قتل کر دیتا، اس کے احکام

کے خلاف سیکن نے بغاوت کی تو اُس نے ایک روز ساڑھے چار ہزار سیکن کو موت کے گھاٹ اُتار کر اُن سے بدلہ لیا، اسی طرح ولیم اوّل نے ۱۰۶۶ء میں برطانیہ پر حملہ کیا تو اس کا عام حکم تھا، کہ آدمی اور جانور دونوں میں سے کسی کی رعایت نہ کی جائے، گھر، غلّے اور کاشتکاری وغیرہ سب برباد کر دی جائیں، ایک لاکھ آدمی اس وحشیانہ سلوک کے شکار ہوئے، نو سال تک یورک اور ڈرہم کے بیچ میں زمین کے کسی ٹکڑے پر کھیتی نہیں ہوئی، اور چند سال کے اندر سارے عہدے اور اختیارات ملکی باشندوں سے لے کر نارمنوں کو دیدیئے گئے، جنھوں نے اصلی باشندوں کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھا، اُن کے کھیتوں کو برباد کیا، اُن کی عورتوں سے بدسلوکی کی، افراد کو جیلوں میں بند رکھا، سترہویں صدی میں جرمنی میں تیس سالہ جنگ شروع ہوئی جس میں یورپ کی کئی حکومتیں ملوّث ہوئیں، اس کی ابتدا تو پروٹسٹنٹ اور رومن کیتھولک کے اختلافات سے ہوئی لیکن پھر یہ سیاسی اقتدار کی جنگ میں منتقل ہو گئی، اس طویل مدت کی لڑائیوں میں بوہیمیا کے ۳۵ ہزار گانوں میں صرف چھ ہزار گاؤں باقی رہ گئے تھے، مورویا، کوریا، فرینکونیا اور سوابیا خونریزی، قحط اور وباؤں سے بالکل تباہ ہو گئے، جرمنی میں ایک کروڑ ساٹھ لاکھ کی آبادی میں سے صرف ساٹھ لاکھ آدمی زندہ رہ گئے، اسی طرح اسپینیوں نے میکسیکو اور پیرو پر حملہ کیا تو اُن کے ہاتھوں میں بائبل تھی، اور پادری اُن کے ساتھ تھے۔ پھر اس حملہ میں جو سفّاکی اور خونریزی کی گئی، اس کی تفصیلات تاریخوں میں ہیں، اسی طرح کی اور بھی مثالیں ڈاکٹر صاحب نے دی ہیں، جس کی سند میں یوروپین مورخوں کے حوالے دیئے ہیں ڈاکٹر صاحب نے ان یوروپین فاتحوں کی بربادی، غارتگری اور خونریزی کے مقابلہ میں محمد بن قاسم، محمود غزنوی، محمد غوری، اور قطب الدین ایبک وغیرہ کی فتح و تسخیر کے سلسلہ میں جو ہولناکیاں ہوئیں، اُن کو ہیچ قرار دیتے ہیں،

آخری باب میں مخلصانہ طور پر ہندو مسلمانوں کے اتحاد و یگانگت کے سلسلہ میں کچھ تجویزیں پیش کیں جو مختصر طور پر اس طرح درج ہیں (۱) ہندو مسلمانوں کے میل جول سے ایک عمدہ زبان تیار ہوئی، جو اردو، ہندی، ہندوستانی اور ریختہ کے مختلف ناموں سے یاد کی جاتی ہے، ہندوستانی کی سرپرستی ہر طرح کی جائے، اس کے لئے ناگری اور اردو دونوں رسم الخط اختیار کرلیئے جائیں، ہندو اور مسلمان دونوں یہ رسم الخط سیکھیں، (۲) ہندوستان کی تاریخ ہندو مسلمان دونوں کو قریب تر کرنے کی غرض سے مرتب کی جائے، (۳) تعلیمی اداروں کے نصاب کا نہج بدلا جائے، (۴) ہندو مسلمان دونوں کے ادب کی سرپرستی کی جائے، (۵) دونوں کے تہواروں کے موقع پر میل ملاپ کے جذبے کا اظہار کیا جائے، (۶) اقلیتوں سے وفاداری طلب کرنا حماقت قرار دیا جائے، اس سے اقلیتوں میں اشتعال پیدا ہوتا ہے، جواہر لال نہرو کے قول کے مطابق اکثریت کو اقلیت کے ساتھ ایسا روادارانہ رویہ اختیار کرنا چاہئے کہ اقلیتیں خود ملک کی وفادار ہونے پر مجبور ہو جائیں، (۷) مسلمان قرآن کی اس تعلیم پر عمل کریں کہ تمام بنی نوع انسان بھائی بھائی ہیں۔ (۸) وہ سنسکرت اور ہندی زبان سیکھیں، ہندوؤں کی مقدس کتابوں خصوصاً گیتا کا مطالعہ کرکے دیکھیں کہ ان میں کیا کیا چیزیں لکھی ہوئی ہیں، عربوں نے ہندوؤں کے علوم و فنون کو عربی زبان میں منتقل کرکے ایک مثال پہلے سے اُن کے سامنے پیش کردی ہے، (۹) ہندوؤں کو گاندھی جی کی اس نصیحت پر عمل کرنا چاہیے کہ ہندوستان کی نجات ہندو مسلم اتحاد کے بغیر نہیں ہوسکتی ہے۔ (۱۰) ہندوستان اور پاکستان دونوں کی بھلائی اسی میں ہے کہ دونوں دوست بن کر ایک دوسرے سے قریب رہیں، دونوں مل کر ہی دنیا میں اہم کارنامے انجام دے سکتے ہیں، محبت اور یگانگت کبھی ناکام نہیں ہوتی،

اپنا اثر دکھاتی رہتی ہے،

ڈاکٹر صاحب نے یہ ساری باتیں بہت ہی اخلاص اور سچائی سے لکھی تھیں لیکن ملک کی فضا کچھ ایسی مکدر ہو گئی تھی کہ اُن کی آواز صدا بصحرا ہو کر رہ گئی مستقبل میں جب کبھی جذباتی ہم آہنگی کی تحریک کو وقتی اور سیاسی مصالح کے بجائے سچے دل سے فروغ دینے کی کوشش کی جائے گی، تو ڈاکٹر صاحب کا یہ رسالہ بڑا قیمتی سمجھا جائے گا۔ اس کی بعض باتوں سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن ان کے لکھنے میں دردمندی، دل سوزی، دلداری اور دلجوئی کا جو جذبہ کار فرما ہے، وہ آیندہ ہندوستان کی قومی زندگی کا بڑا قیمتی سرمایہ قرار دیا جائے گا۔ اس میں وہی اسپرٹ ہے جو امیر خسرو نے چودھویں صدی عیسوی میں اپنی مثنویوں دول رانی خضر خاں، اور نہ سپہر میں دکھائی ہے جس طرح امیر خسرو کی رواداری اور فراخدلی کی قدر اب بھی باقی ہے، اسی طرح کیا عجب کہ آیندہ ڈاکٹر صاحب کے ان مخلصانہ اور روادارانہ جذبات کا احترام پورے طور پر کیا جائے گا۔

پاکستان وجود میں آگیا تو اس کی تحریک کی مخالفت کے باوجود ڈاکٹر صاحب اس کے مخالف بھی نہ رہے، کہتے کہ یہ تاریخ کا فیصلہ ہے تو مان لینا چاہئے تاریخ ہی پھر بتائے گی، کہ یہ مسلمانوں کے لئے رحمت یا زحمت بن کر رہے گا، پھر بھی اُن کی خواہش رہی کہ دو بھائی بچھڑ گئے ہیں کسی طرح اُن کی دوری دور ہو جائے، اور وہ ایک دوسرے سے قریب تر رہیں، انھوں نے مذکورہ بالا مقالہ میں دبے الفاظ میں دونوں ملکوں کے مشترکہ دفاع کا خیال اس طرح ظاہر کیا،

"پاکستان ایک دو بڑی طاقتوں کے ساتھ اتحاد کا معاہدہ کر سکتا ہے لیکن وہ اس نتیجہ پر پہونچے گا کہ اس کا مفاد گھر کے نزدیک ہی وابستہ ہے یعنی ہندوستان

کے قریبی تعلقات اور دوستی سے، یہ حقیقت دونوں ملکوں کے لئے سچائی پر مبنی ہے، دونوں ملکوں کے اختلافات اس وقت فوراً دور ہو جائیں گے، جب دونوں ایک مشترکہ دفاع کے تئے فیصلہ کریں گے، میری عاجزرائے میں یہ دونوں ملکوں کے اختلافات کے امراض کا موثر علاج بھی ہو جائے گا، دونوں ملک اشتراک سے دنیا کے معاملات میں ایشیائی ملکوں کے ساتھ جو اہم رول ادا کر سکتے ہیں، اس پر جتنا زیادہ غور کیا جائے گا اتنا ہی مشترکہ دفاع کے دانشمندانہ اقدام کی اہمیت ظاہر ہوگی۔ میں ایک سال سے زیادہ اس مسئلہ پر غور کر کے اس کی افادیت کا قائل ہوا ہوں، لیکن اس پر کھلے طور پر اپنے خیالات کا اظہار نہ کر سکا کہ ممکن ہو کہ میری طرف سے غلط فہمی پیدا ہو جائے، لیکن اس سلسلہ کے پاکستان کے بعض ذمہ دار اشخاص کے بیانات سے میں خوش ہوا، اور لب کشائی کر رہا ہوں"

وہ بہار کے وزیر ہی تھے کہ ۱۹۴۹ء میں انھوں نے اسٹیٹسمین میں کئی قسطوں میں ایک لمبا مضمون لکھکر دونوں کے مشترکہ دفاع پر پھر زور دیا، اس سلسلہ میں اُن کے خیالات کی وضاحت اس انٹرویو کے حسب ذیل اقتباسات سے ہوگی، جو رسالہ دوام میں شائع ہوا تھا:

"میں نے آزادی کے بعد ہی ۱۹۴۹ء میں چھ آرٹیکل اس موضوع پر اسٹیٹسمین میں لکھے تھے، میری تجویز یہ تھی کہ ہندوستان اور پاکستان کو متحدہ دفاع پر راضی ہو جانا چاہئے، میں نے اس کا سیاسی، فوجی اور معاشی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا تھا، اور تقسیم کے نتیجہ میں جو زخم اس برصغیر کو لگا تھا اس کا واحد علاج

میں نے اسی کو بتایا تھا، پھر ۱۹۵۳ء میں جب بہار چھوڑ کر پارلیمنٹ میں آیا تو یہاں بھی اس موضوع کو لے کر میں نے اسپیچ دی، پرشوتم داس ٹنڈن نے میری تائید کی، پنڈت جواہرلال نہرو کچھ نہیں بولے۔ جب میری اسپیچ اخباروں میں آئی تو پاکستان میں لیاقت علی خاں نے یہ سمجھا کہ میں نے جواہرلال کے ایما پر یہ خیالات پارلیمنٹ میں ظاہر کئے ہیں، انھوں نے فوراً بیان دیا کہ ہم متحدہ دفاع کے لئے تیار ہیں، اگر حکومت ہند راضی ہے لیکن ایک روز پنڈت جواہرلال نہرو نے کہا کہ چھوڑو یہ قصے، میں نے کہا کہ نہیں میں یہ سمجھتا ہوں کہ ایک روز یہ ضرور ہوگا، بالآخر پنڈت جواہرلال نہرو کی عدم دلچسپی کی وجہ سے یہ تجویز آئی گئی ہوگئی، اسی زمانہ میں ایک دن میں مڈل ایسٹ کے دورہ سے واپس کراچی ایرپورٹ پر رکا، تو نامہ نگاروں نے دو بجے رات میں مجھ سے انٹرویو لیا، انھوں نے پوچھا کہ جوائنٹ ڈفنس سے آپکے وزیراعظم نے مخالفت کی ہے، تو آپ کی کیا رائے ہے، میں نے کہا میں پرائم منسٹر کی رائے کے خلاف ہوں، ہمارے یہاں تو جمہوریت ہے، اس طرح کے اختلاف رائے کی پوری آزادی ہے، میں نے انھیں بتایا کہ اس تجویز سے میری غرض یہ تھی کہ دو بھائیوں کو باہم قریب لانے کے لئے معاہدہ ہو، غرض میری اس صدا کی بازگشت ....

...... جنرل کریاپا کے مضامین میں سنائی دی، جنرل کریاپا اس معاملہ میں بہت آگے تھے۔ جوائنٹ ڈفنس کی پرزور وکالت کر رہے تھے، مجھے یاد ہے کہ وزیراعظم پنڈت جواہرلال نہرو نے اسی زمانہ میں ٹیلیفون پر بلا کر کریاپا کو بہت برا بھلا کہا تھا کہ وہ بے وقوف ہے اور یہ سب احمقانہ باتیں ہیں، پھر اس کے

بعد پاکستان میں صدر محمد ایوب کے زمانہ میں یہ مسئلہ اٹھا، انھوں نے بھی متحدہ دفاع کی پیش کش ہندوستان کو کی، میں نے اس وقت ایک انٹرویو میں صدر ایوب کی اس خیرسگالی کے جذبے کی تعریف کی، اور یہ بتایا کہ اس طرح کی بات میں ۱۹۴۹ء سے سوچ اور لکھ رہا تھا، مجھے یاد ہے کہ اس پر لاہور کے اخبار نوائے وقت نے مجھے گالیاں دی تھیں کہ اس طرح کی بات میرے علاوہ اور کون سوچ سکتا ہے، صدر ایوب کی تجویز بھی ہوا ہو گئی، اس لئے کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے اسے رد کر دیا، اس پر میں نے پنڈت جواہر لال نہرو کو بلیم (Blame) دیا، پھر جب بر وہی آئے، اور پنڈت جواہر لال نہرو کے صدر ایوب سے ملاقات کے لئے وہاں جانے کا پروگرام بنایا تو اس وقت بھی میں نے بروہی سے کہا کہ جا کر ایوب سے کہیں کہ پانی وغیرہ کا مسئلہ پہلے طے کر لیں، کشمیر کا مسئلہ بعد میں حل ہو جائے گا، ان کو میری یہ بات ناگوار گذری اور کہا کہ صدر ایوب اگر دوستی کا ہاتھ بڑھائیں تو کیا آپ انکار کر دیں گے، غرض میری اس طرح کی کوشش لاحاصل ہوئی، مجھے یاد پڑتا ہے کہ آزادی کے بعد ہی کسی آرٹیکل میں لکھا تھا، کہ چین کے سیاسی ارتقاء کی روشنی میں ہمیں اس کے بارے میں خصوصی طور سے ہوشیار رہنا چاہئے"

ڈاکٹر صاحب کی یہ مخلصانہ تجویز آج بیس برس کے بعد بھی مفید اور قابل عمل نہیں سمجھی جا رہی ہے، اس درمیان میں ہندوستان اور پاکستان دو بار خون کا غسل لے چکے ہیں، آیندہ کیا ہوگا، قدرت ہی کو معلوم ہے، مگر ڈاکٹر صاحب آخر آخر وقت تک یہ کہتے رہے کہ کسی نہ کسی زمانہ میں مشترکہ دفاع ضرور عمل میں آئے گا،

ڈاکٹر صاحب قلمی کاوشوں کے ساتھ ساتھ اپنی اور دوسری سرگرمیوں میں مشغول رہے، ۱۹۴۹ء میں جمعیۃ العلماء کا ایک بڑا جلسہ یو۔ پی میں ہوا، اس میں ڈاکٹر صاحب بھی شریک تھے۔ اترپردیش کے وزیر اعلیٰ گوبند بلبھ پنتھ بھی اس میں خاص طور سے مدعو کئے گئے تھے، انھوں نے علماء حضرات کی توقع کے خلاف اردو پر ایک سخت تقریر کر دی اور کچھ اس طرح کی باتیں کہیں کہ اردو جو ہیاہے، اور ہندی ہاتھی ہے۔ اس پر غیر ملکی اثرات ہیں، یہ سہراب و رستم اور افراسیاب کی باتیں کرتی ہے، لیلیٰ و مجنوں کی باتیں کرتی ہے، پھر اردو آزاد ہندوستان میں کیا ترقی کرے گی، ڈاکٹر صاحب کو یہ تقریر ناگوار گزری اس کے جواب میں انھوں نے کہا:-

"پنت جی اردو بہت سخت اور بُری ہے، لائق توجہ نہیں، میں سب تسلیم کئے لیتا ہوں، آپ یو۔ پی کے چیف منسٹر ہیں، اردو کے خلاف نفرت کے جذبات پھیلے ہوئے ہیں، چلئے آپ جو زبان اس وقت بولتے ہیں، اسی کو یہاں رائج کر دیجئے، آپ سمجھتے ہیں کہ اردو شیریں و فرہاد اور لیلیٰ مجنوں کے گیت گاتی ہے، اس لئے قابلِ گردن زدنی ہے، میں پوچھتا ہوں کہ کیا یہ لوگ رستم و افراسیاب مسلمان تھے؟ آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ مسلمان نہیں تھے، یہ تو مسلمانوں کی بلند ظرفی ہے کہ وہ جہاں گئے، انھوں نے وہاں کے ہیروز کو اپنا لیا، خود ہندوستان میں بھی ان کا یہی رول رہا ہے، چنانچہ اُردو نے رام اور کرشن کے نغمے اور یہاں کی روحانی قدروں کے ترانے دنیا کو سنائے ہیں، یہ ایک جمہوری زبان ہے"

(بحوالہ رسالہ دوام، جون، جولائی ۱۹۷۱ء)

اپنی اس تقریر کا ذکر دارالمصنفین کی صحبتوں میں بھی کیا تھا، ان کی خواہش اور کوشش برابر

یہ رہی کہ اردو یو۔ پی۔ اور بہار میں دوسری زبان کی حیثیت سے تسلیم کر لی جائے، وہ کہا کرتے تھے کہ اس کے لئے صدر جمہوریہ کا آرڈیننس جاری کر دیا جاتا تو یہ تسلیم کر لی جاتی، مگر پنڈت جواہر لال نہرو نے اس میں کمزوری دکھائی، ان پر اس کو تسلیم کرانے کے لئے زور دیا جاتا تو وہ یہ کہتے کہ یو۔ پی۔ والے نہیں ماننے کے لئے تیار رہیں، کیا کیا جائے، کیا ان کے خلاف فوج بھیجی جائے، مگر ڈاکٹر صاحب اس کو تسلیم کرانے کی کوشش میں برابر لگے رہے، مسز اندرا گاندھی کی پہلی وزارت عظمیٰ کے زمانہ میں بہار میں شری کرشن بلبھ سہائے وزیر اعلیٰ ہوئے، تو ڈاکٹر صاحب نے ان کو آمادہ کیا کہ وہ اپنی حکومت کی طرف سے وزیر اعظم کو لکھیں کہ وہ صدر جمہوریہ سے اردو کے متعلق مسلمانوں کے مطالبہ کی منظوری کا اعلان کر دیں، کرشن بلبھ سہائے پہلے تو اس کے لئے راضی نہیں ہوئے، مگر ڈاکٹر صاحب کے اصرار سے بقول انہی کے بڑی بہادری سے اپنی حکومت کی طرف سے ایک تجویز پاس کر کے وزیر اعظم کے پاس دہلی بھیجی، اس تجویز کے موصول ہونے کے بعد مسز اندرا گاندھی یو۔پی۔ کی وزیر اعلیٰ مسز سوچیتا کرپلانی سے بھی اسی قسم کی تجویز کی خواہاں ہوئیں، لیکن انھوں نے اس سے انکار کر دیا، ڈاکٹر صاحب کو جب یہ معلوم ہوا تو انھوں نے مسز اندرا گاندھی سے مل کر کہا کہ بہار کی حکومت نے اردو کے متعلق آپ کو جو لکھا ہے کیا وہ صدر جمہوریہ سے اردو کے متعلق کوئی اعلان کرانے کے لئے کافی نہیں ہے؟ مسز اندرا گاندھی خاموش رہیں، ڈاکٹر صاحب پھر صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر رادھا کرشنن سے مل کر اردو کے متعلق گفتگو کی جس سے متاثر ہو کر انھوں نے اپنی تقریر میں دو بار اردو کی حمایت کی، اور لوگوں کی توجہ اس کی طرف دلائی (نیز دیکھو قائد ۲۰ مئی سنہ ۱۹۷۱ء لکھنؤ) سنہ ۱۹۶۷ء میں عام انتخاب ہوا تو ڈاکٹر صاحب نے مسز اندرا گاندھی سے مل کر کانگریس کے منشور

میں اُردو کو رعایتیں دلانے کی طرف بھی اُن کو توجہ دلائی، تو انھوں نے ان سے کہا کہ اُردو کے مسئلہ کو کانگریس کے منشور میں درج کرانا چاہتی تھی، میرے ساتھی بھی اس پر راضی ہو گئے تھے لیکن مجلس مشاورت کا منشور شائع ہوا تو یہ خیال ہوا کہ اس مرتبہ جب سارا ملک کانگریس کو دھمکی دے رہا ہے مسلمان بھی دھمکیاں دینے لگے ہیں، ان دھمکیوں کی وجہ سے اُردو کو کانگریس میں داخل کرانے میں میرے ساتھیوں نے میرا ساتھ نہیں دیا، مجلس مشاورت سے اس وقت تک ڈاکٹر صاحب کا تعلق تھا، مسز اندرا گاندھی نے مجلسِ مشاورت کے جس منشور کا حوالہ دیا تھا، اس کی نوعیت ڈاکٹر صاحب کے بیان کے مطابق یہ تھی کہ جولائی ۱۹۶۷ء میں مجلس مشاورت کا ایک بہت ہی عمدہ منشور ان کے مشورے سے تیار ہوا تھا لیکن اُس کے بعض اراکین کے اصرار سے اُس کے کچھ ایسے حصے نکال دیئے گئے، جو بقول ڈاکٹر صاحب اتحاد و اتفاق کے مقصد کے لئے بہت مفید تھے، اور ان کے بجائے ایک صفحہ ایسا بڑھایا گیا جو کانگریس کی شکایتوں اور دھمکیوں سے پُر تھا، ڈاکٹر صاحب کو اس سے تکلیف رہی۔

پھر بھی ان کو مسز اندرا گاندھی سے امید رہی کہ وہ اردو کو اُس کے جائز حقوق ضرور دیں گی، اُن کی حمایت میں ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۷۱ء کے انتخاب میں جو تقریریں کیں یا تحریریں لکھیں اُن میں مسلمانوں کو امید دلائی کہ پارلیمنٹ کے اس فیصلہ کن انتخاب میں مسز اندرا گاندھی ضرور اردو کو صحیح مقام دلائیں گی،

ڈاکٹر صاحب کو اردو سے بڑی لگن ضرور رہی، مگر اسی کے ساتھ ان کو ہندی سے بھی محبت رہی، وہ کبیر کے ہندی اشعار کو بہت پسند کرتے، اور ان میں سے کچھ اُن کو زبانی یاد تھے، جو کبھی کبھی سنایا کرتے، دار المصنفین کی نجی صحبتوں میں کہتے کہ ہندی کے مسلمان

شعرا، مثلاً امیر خسرو، ملا داؤد، قطبن، کبیر، ملک محمد جائسی، عبدالرحیم خانخاناں، نیاز بریلوی اور بلگرام کے ہندی شعراء میں میر عبدالواحد بلگرامی، عارف بلگرامی اور سید برکت اللہ بلگرامی وغیرہ کے شاعرانہ کمالات کو اردو میں پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ ان ہی کی گفتگو سے متاثر ہو کر میں نے اُردو میں ایک مضمون "ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں علمی و ادبی رواداریاں" لکھا جو ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کی یادگار جلد میں شائع ہوا۔ ان کی خواہش رہی کہ دارالمصنفین کی ساری مطبوعات کا ترجمہ ہندی میں کیا جائے، مگر میں جب ان سے عرض کرتا کہ ۵۰ کتابوں کے ہندی ترجمے میں لاکھوں روپیے کے سرمایہ کی ضرورت ہوگی، وہ فراہم کردیں، تو یہ کام بھی یہاں سے ہو جائے گا، یہ سن کر خاموش ہو جاتے۔ ڈاکٹر صاحب نے گیتا کا بھی مطالعہ کیا تھا، اس کی تعلیمات میں جو وحدانیت ہے، اُس کا ذکر برابر کرتے، ایک موقع پر کہا کہ میں نے ایک جلسہ میں لاہور کے چودھری دل محمد کے کچھ منظوم اشعار حاضرین کو سنایا، تو انھوں نے سُن کر کہا کہ یہ تو بعض قرآنی آیتوں کے ترجمے معلوم ہوتے ہیں، گیتا کا ذکر کرنے کے ساتھ ہی کہتے کہ کلام پاک میں ہے کہ ہر قوم کے لئے ایک نذیر اور بشیر بھیجا گیا تو ہندوستان میں بھی خداوند تعالیٰ کی طرف سے کوئی نذیر اور بشیر ضرور آیا، پھر کیا ہندوؤں کو اہلِ کتاب نہیں قرار دیا جا سکتا ہے؟ اس سلسلہ میں غلام علی آزاد بلگرامی کی سبحۃ المرجان کی ان روایتوں کے حوالے برابر دیتے کہ جن میں یہ کہا گیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے ہندوستان کی طرف سے ربانی خوشبو آتی ہے، اور حضرت علیؓ نے فرمایا کہ سب سے پاکیزہ اور خوشبودار مقام ہے کیونکہ یہاں حضرت آدمؑ اترے اور یہاں کے درختوں میں جنت کی خوشبو کا اثر ہے، ڈاکٹر صاحب کا استدلال ہوتا کہ ربانی خوشبو اور جنت کی خوشبو کے معنی یہ ہیں کہ یہاں کوئی کتاب ضرور

اتری، پھر یہاں کے لوگ اہل کتاب کیوں نہ قرار دیئے جائیں، ڈاکٹر صاحب یہ ساری باتیں اپنی بے تعصبی میں وطنی جذبات سے متاثر ہو کر کہا کرتے تھے،

ان سے کوئی کہتا کہ بت پرستی پھر بھی بت پرستی ہے، یہ کیسے روا رکھی جا سکتی ہے تو مرزا مظہر جانجاناں کا حوالہ دے کر جواب دیتے کہ ہندو اس شرک کے ذریعہ سے خدا پرستی تک پہونچنے کی کوشش کرتے ہیں، بتوں کے سامنے ان کا سجدہ عبودیت کا سجدہ نہیں، بلکہ تحیت کا ہے پھر کہتے کہ میں عالم نہیں ہوں، میں کوئی فتوی نہیں دے رہا ہوں، اس نقطۂ نظر سے ہندو مذہب کا مطالعہ کرنے کی صرف دعوت دیتا ہوں" ان سے بحث و تمحیص نہیں ہوتی، اُن کی باتیں احتراماً سُن لی جاتیں،

۱۹۵۳ء میں عام انتخاب ہوا، تو وہ بہار کی صوبائی اسمبلی کے بجائے ترہت کے اپنے پرانے حلقہ سے پارلیمنٹ کے لئے کھڑے ہوئے، اور منتخب کر لئے گئے، بہار کی وزارت چھوڑ دی یہ مالی حیثیت سے اُن کے لئے بڑی مضرت رساں ہوئی، کئی موقع پر فرمایا کہ جب وہ اس کی پہلی وزارت میں شریک ہوئے، تو بیس ہزار روپے کے مقروض ہوئے، جب وہ احمد نگر جیل میں تھے، تو قرضداروں کے تقاضے سے عاجز ہو کر اُن کے بڑے لڑکے محبوب احمد صاحب نے فریزر روڈ پٹنہ کی ایک بہت ہی قیمتی زمین سستے داموں فروخت کر کے قرض چکایا، انھوں نے یہ زمین اپنی کوٹھی کے لئے خرید رکھی تھی، اس زمین کے فروخت کر دیئے جانے پر اُن کو زندگی بھر افسوس رہا، دوسری وزارت کے چھوڑتے وقت وہ چالیس ہزار کے مقروض تھے، پھر کچھ کھیت اور جائداد فروخت کر کے یہ بھاری قرض ادا کیا گیا، ہندوستان میں ایسی مثال شاید نہ ملے گی، وزارت کے ذریعہ معلوم نہیں کتنے لوگ بن گئے لیکن ڈاکٹر صاحب مالی نقصان ہی اٹھاتے رہے، انکا بڑا سا بڑا ناقد اُن پر یہ الزام نہیں رکھ سکتا ہے کہ انھوں نے کسی موقع پر بھی ذاتی فوائد اٹھائے، یا اعزہ پروری کی، وہ

تو اپنے لڑکوں اور دامادوں کو بھی حکومت کی طرف سے اچھے عہدے نہیں دلا سکے، اُن کے بڑے لڑکے محبوب احمد صاحب گھر ہی پر رہتے ہیں، منجھلے لڑکے حبیب احمد صاحب بی اے علیگ ہیں، صرف گرائجویٹ ہی نہیں ہیں، بلکہ سیاسی اور بین الاقوامی معلومات کے خزانہ ہیں، ڈاکٹر صاحب اُن کے بارہ میں کہا کرتے کہ "بڑا ہی قابل" ہے، مگر وہ بھی گھر پر رہتے ہیں، ڈاکٹر صاحب نے اُن کو کبھی کوئی ملازمت دلانے کی کوشش نہیں کی، ان کے چھوٹے صاحبزادے سعید احمد جرمنی کی کسی جرنیورسٹی میں پروفیسر ہیں، اُن کے بڑے داماد مرحوم سی پی میں کسی محکمہ کے ڈائرکٹر تھے، مگر ان کے پاس باہر کی ڈگری تھی، ملازم ہو چکے تھے ....

.... تو ڈاکٹر صاحب کے یہاں رشتہ ہوا، منجھلے داماد پاکستان میں ملازم ہیں، چھوٹے داماد لائف انشورنس میں ملازم ہیں، وہ غیروں کو ملازمت دلانے میں اُن کے لئے ہر قسم کی سفارش کرتے، اور اداروں یا قومی کاموں کے لئے سرمایہ فراہم کرانے میں پیش پیش رہتے، دارالمصنفین کی مالی امداد کے لئے پنڈت جواہرلال نہرو کے پاس اس کی ایک درخواست لے کر گئے، تو ان سے بے تکلفی اور گہرے تعلقات کے باوجود کہا کہ میں ایک عرض گذار کی حیثیت سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں،

وہ ۱۹۵۳ء میں مرکزی وزارت میں پنڈت جواہرلال نہرو کے شعبۂ امور خارجہ میں وزیر مملکت بنائے گئے، اپنی اس وزارت کے زمانہ میں ہندوستان کی طرف سے خیرسگالی کا پیام لے کر عراق، لبنان، کویت اور ترکی گئے، مگر اس زمانہ میں ان کی بصارت اور سماعت دونوں کم ہونے لگی۔ اس لئے وہ خود اپنی وزارت سے مطمئن نہ تھے، ایک موقع پر فرمایا کہ جب وہ پارلیمنٹ میں جاتے۔ اراکین سوال کرتے، تو وہ ٹھیک سے سُن نہیں پاتے جس سے وہ اپنی سبکی محسوس کرتے، اس لئے انھوں نے خود ہی طے کیا کہ وہ وزارت سے علحدہ ہو جائیں، یہ

طے کرکے مولانا ابوالکلام آزاد سے ملنے گئے، اور اپنا ارادہ ظاہر کیا، مولانا نے ان سے اتفاق کیا، بعد میں ڈاکٹر صاحب کو معلوم ہوا کہ مولانا نے ان سے اس لئے اتفاق کیا کہ ان کے کان میں یہ بات پڑی تھی کہ پنڈت گوبند بلبھ پنت نے جو اس زمانہ میں مرکزی وزارت میں ہوم ممبر تھے کسی بار اپنے ملنے والوں سے کہا کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے تو اپنے اندھے بہرے دوستوں کو وزارت میں بھر رکھا ہے، اس کے بعد وزارت سے علٰحدہ ہونے میں ڈاکٹر صاحب اور راسخ ہوگئے، لیکن پنڈت جواہر لال نہرو نے اُن کو علٰحدہ ہونے نہیں دیا،

۱۹۵۷ء کے عام انتخاب میں وہ پھر اپنے حلقہ سے پارلیمنٹ کے لئے منتخب ہوئے، مگر کسی عہدہ کے خواہاں نہیں ہوئے، اخباروں میں خبریں شائع ہوتی رہیں کہ وہ فلاں صوبہ کے گورنر، یا فلاں صوبہ کے سفیر مقرر کئے جانے والے ہیں، مگر وہ خود تمام عہدوں سے منھ موڑ چکے تھے، وہ اپنے گھر کے کاموں میں لگ گئے، ان کے دو بہنوئی لاولد مرے، اُن کے وارث وہی ہوئے ان کے اور اُن کے بہنوئی کے جو علاقے اور گاؤں اعظم گڈھ، جونپور، غازی پور اور چھپرہ کے اضلاع میں تھے، ان میں وہ ایک ہزار بیگھے سے زیادہ کھیتوں کے مالک ہوگئے، انہی کی دیکھ بھال میں ان کا وقت گذرنے لگا، اعظم گڈھ کے ایک گاؤں، سوگھر پور آتے، تو دارالمصنفین بھی ضرور آتے، اس طرح اُن کا یہاں آنا جانا بہت بڑھ گیا، مگر اُن کے پہلے اور اب آنے میں بڑا فرق یہ ہوگیا کہ بہار کی وزارت یا مرکزی وزارت کے زمانہ میں جب جب یہاں آئے، کلکٹر، ایس۔پی، اور مسلح گارد آگے پیچھے رہتے، مگر وزارت کے بعد جب آئے تو دارالمصنفین ہی کے عقیدت مند اُن کو سر آنکھوں پر بٹھا کر اسٹیشن سے شبلی منزل لاتے، سیاسی زندگی کی یہ نیرنگیاں بھی بڑی سبق آموز ہوتی ہیں،

دارالمصنفین میں استاذی المحترم علامہ سید سلیمان ندویؒ کے بہت گرویدہ تھے، وہ برابر کہتے کہ وہ اپنی زندگی میں علماء کے طبقہ میں سے مفتی کفایت اللہ، مولانا سید سلیمان ندوی، اور

مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی سے بہت متاثر ہوئے، فرماتے کہ مفتی کفایت اللہ سیاسی کاموں میں پیش پیش رہے، قومی کاموں کے لئے اُن کے پاس بڑا سرمایہ بھی جمع کردیا جاتا، مگر کوئی ان پر ایک پیسہ کے بیجا خرچ کرنے یا ذاتی مصرف میں لانے کا الزام نہیں رکھ سکتا تھا، مولانا سید سلیمان ندوی کی علمی گہرائی، عالمانہ بصیرت، اور اسی کے ساتھ ان کے اخلاص، نیکی اور معصومیت کے بھی بڑے قائل تھے، مولانا مناظر احسن کی عالمانہ ظرافت کے معترف رہے، اُن کی ہر قسم کی باتوں سے دلچسپی لیتے،

ڈاکٹر صاحب کا بیان ہے کہ ایک بار انھوں نے مولانا مناظر احسن صاحب سے پوچھا کہ اگر کسی زمین یا مندر کو غصب کر کے اس پر مسجد بنائی جائے، تو کیا اس میں نماز پڑھنی جائز ہوگی؟ مولانا نے کہا ہرگز نہیں، مگر اسی کے ساتھ انھوں نے کہا کہ میں علی الاعلان یہ بات نہیں کہہ سکتا ہوں اور نہ کوئی فتوی دے سکتا ہوں، کیونکہ مجھے یقین ہے کہ اس کے بعد مسلمان مجھے قتل کردیں گے، بہار کی وزارت کے زمانہ میں ان دونوں بزرگوں کو کسی نہ کسی بہانے سے اپنے یہاں ضرور مدعو کرتے، کبھی عربی مدارس کے نصاب، کبھی اوقاف اور کبھی کسی اور سلسلہ میں کمیٹیوں میں نامزد کر کے ان کو مدعو کرتے، اور ان کی صحبت سے لطف اٹھاتے، وہ علامہ سید سلیمان ندوی کو بڑے احترام کے ساتھ خط لکھتے،

۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۱ء کے آغاز تک ڈاکٹر صاحب کی سیاسی سرگرمیاں اس سے زیادہ نہیں رہیں، کہ وہ پارلیمنٹ میں شرکت کرتے، اور کبھی کبھی کسی بحث میں حصہ لے لیتے، اس اثناء میں ہندو مسلم فسادات ملک میں جا بجا ہوتے رہے، ہندوستان کے مسلمانوں میں بڑی بددلی پھیلی ہوئی تھی، اکثریت کے فرقہ کا عام خیال تھا کہ پاکستان ہندوستانی مسلمانوں کے ووٹ سے بنا، اگر وہ کانگریس کا ساتھ دیتے، تو ملک کی تقسیم نہ ہوتی، اس لئے وہ مشکوک نظروں

سے دیکھے جاتے، اور اُن کو غیر وفادار سمجھا جاتا، اُن کی وفاداری کا سوال بار بار اٹھا، دستورِ ہند میں ان کو تو بظاہر پورا حق دیا گیا تھا، مگر اس پر عمل نہ ہوتا، فسادات ہوتے، تو اُن کے جان و مال کو بڑا نقصان پہنچتا، اُن کے دلوں میں عام خیال ہو گیا تھا، کہ پولیس اور فوج، حتی کہ حکومت کی طرف سے اُن کی وہ حفاظت نہیں ہوتی ہے، جو ہونی چاہیئے، ڈاکٹر صاحب نے بھی ان باتوں کو محسوس کیا، ان کا ملی جذبہ ابھرا، ۱۹۶۰ء میں انھوں نے ایک مسلم کنونشن منعقد کرنے کی تجویز پیش کی، ڈاکٹر صاحب کا بیان ہے کہ پنڈت جواہرلال نہرو نے مسلم کنونشن کے انعقاد کی تجویز کو ناپسند کیا، مگر انھوں نے اُن کی ناپسندیدگی کا خیال کئے بغیر دہلی میں یہ کنونشن طلب کیا، وہ اس کے صدر منتخب ہوئے، ملک کی آزادی کے تیرہ سال بعد مسلمانوں کا یہ پہلا بڑا اہم اجتماع تھا، اس میں ان کا خطبۂ صدارت بڑا پُرزور تھا، جس میں انھوں نے مسلمانوں کے تعلیمی اور اقتصادی فلاح و بہبود کے مفید مشورے دیئے، اخباروں میں یہ سب تو نظرانداز ہو گئے، مگر پورا ملک اُن کے خطبے کے بعض ٹکڑوں سے گونج اٹھا، جن میں انھوں نے فرمایا کہ "ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ اس وقت مجرموں، غداروں اور دوسرے درجہ کے شہریوں کا سلوک کیا جاتا ہے، ہندوستان میں مسلمان دوسرے درجہ کے شہری بن کر رہنا ہرگز برداشت نہ کریں گے، جبل پور میں جو زبردست بلوا ہوا ہے، وہ آخری بلوا نہیں ہے، ایسے بلوے اُس وقت تک ہوتے رہیں گے، جب تک کہ مسلمانوں کو بڑی تعداد میں پولیس اور فوج میں بھرتی نہ کیا جائے گا، جن میں اُن کی بھرتی بند ہے، کیونکہ عام طور پر ہندو سمجھتے ہیں کہ حکومت مسلمانوں کو غدار سمجھتی ہے"

ان الزامات سے پنڈت جواہرلال نہرو پر بڑے اثرات مترتب ہوئے، ان کو اپنے پرانے رفیق کے ان اعتراضات سے دکھ پہونچا، اور وہ ڈاکٹر صاحب سے خفا ہوئے، مگر

ڈاکٹر صاحب کا بیان ہے کہ اسی کے ساتھ پنڈت جی کو بھی یہ کہنا پڑا کہ اگرچہ مسلمانوں کے دوسرے درجہ کے شہری ہونے کی بات کو میں غلط سمجھتا ہوں، مگر جب سید محمود جیسا شہری کہہ رہا ہے تو ہمیں سوچنا چاہئے یہ شرم کی بات ہے کہ اس طرح کا خیال مسلمانوں میں ہماری کوتاہیوں کی وجہ سے پیدا ہو رہا ہے، (رسالہ دوام، جون، جولائی ۱۹۷۱ء ص)

ڈاکٹر صاحب اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں :-

یہ باتیں میں نے پنڈت جواہر لال نہرو جیسے زبردست اور محبوب وزیر اعظم کے زمانے میں کہی تھیں، گویا میں پنڈت نہرو کی حکومت پر الزام رکھ رہا تھا، حالانکہ ان سے میرے بہت گہرے دوستانہ تعلقات تھے، اس لئے میرے خطبہ پر ایسی ہل چل مچی کہ اگر میری پکڑ دھکڑ ہوگئی ہوتی تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی، یہ تو نہ ہوا لیکن میرے بہت سے کانگریسی دوست جن کے ساتھ میں عرصۂ دراز سے کام کرتا چلا آیا تھا، مجھ سے خفا ہو گئے، اور پھر ہندوؤں کے اعتراضات کی بھرمار ہونے لگی، میں نے کسی کا جواب نہیں دیا، مگر ٹھیک دس سال کے بعد ۱۹۷۰ء میں مسز اندرا گاندھی، اور مسٹر چوان نے بالکل وہی باتیں کہیں جو میں نے کہی تھیں ،، (عزائم، ۲۰ مئی ۱۹۷۱ء ص ۶)

ڈاکٹر صاحب کا بیان تھا کہ انھوں نے جو باتیں کہی تھیں، ان میں ملک، حکومت یا ہندوؤں کے خلاف کوئی جذبہ نہ تھا، بلکہ وہ مخلصانہ طور پر اس نتیجہ پر پہونچے تھے کہ ملک کی فلاح و بہبود اس میں ہے کہ اگر یہاں کی صرف اکثریت ترقی کرتی رہی تو یہاں کی اقلیت پسماندہ رہ کر ملک کے لئے ایک بڑا بار اور سوال بن جائے گی، پھر بھی اُن پر فرقہ واریت کا الزام آیا، لیکن وہ غصہ میں کہتے کہ اگر ان میں فرقہ واریت ہے تو ہندوستان میں کسی میں بھی قومیت نہیں، اسی سلسلۂ گفتگو میں یہ بھی کہا کہ فرقہ واریت اور

قومیت کا بھی عجیب تصور ہو گیا ہے، اسی لئے ڈاکٹر ابید کر نے بہت آزردہ ہو کر لکھا ہے۔

Indian natimalism has developed a new doctrine which may be Colled Divine Right of The majority to mle The minority accordwy to the wishes of the majority. Any claim for sharing The power by minority is Callel Cowmunalism while the monopolising of The whole power by the majority is callel natiunalism

(ہندوستانی قومیت کا ایک نیا نظریہ نشو ونما پا گیا ہے، جس کے یہ معنی ہیں کہ اکثریت کو اس کی اپنی مرضی کے مطابق اقلیت پر حکومت کرنے کا یزدانی حق حاصل ہو گیا ہے، اگر اقلیت اقتدار میں حصہ دار ہونے کی خواہش ظاہر کرتی ہے، تو یہ فرقہ واریت کہلاتی ہے، اکثریت کا تمام اقتدار کے مالک بنانے کا نام قومیت ہے،)

اس کا حوالہ دے کر کہا کہ امید ہے کہ اکثریت ہندوستان کے مفاد میں اپنے قول و فعل سے اس بات کا ثبوت دے گی کہ ڈاکٹر ابیدکر قومیت کی جو تعریف کر گئے ہیں، وہ صحیح نہیں، اس موقع پر ایک صاحب نے اُن کو توجہ دلائی کہ مولانا محمد علی مرحوم نے گول میز کانفرنس کی آخری تقریر میں جو یہ کہہ گئے ہیں، ان کے متعلق کیا خیال ہے،

"جہاں تک خدا کے احکام کا تعلق ہے، میں اول مسلمان ہوں بعد میں مسلمان ہوں آخر میں مسلمان ہوں، اور کچھ بھی نہیں صرف مسلمان ہوں لیکن جہاں ہندوستان کا مسئلہ آتا ہے تو میں

پہلے ہندوستانی ہوں، بعد میں ہندوستانی ہوں، آخر میں ہندوستانی ہوں اور کچھ بھی نہیں صرف ہندوستانی ہوں"

اس کے جواب میں کہا "یہ بات غلط نہیں کہی جا سکتی ہے"، پھر ایک اور دوسرے صاحب نے کہا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے صدر جمہوریہ کی حیثیت سے اپنی ایک تقریر میں بڑی صفائی سے کہا کہ پہلے مسلمان اور بعد میں ہندوستانی ہونے میں کوئی تضاد نہیں، اچھا اور سچا مسلمان ہی اچھا اور سچا ہندوستانی ہو سکتا ہے، ڈاکٹر صاحب نے یہ سن کر کہا کہ صحیح ہے، اچھائی اور سچائی ہر حال میں کامیاب رہتی ہے، ان پر حرف نہیں آ سکتا۔ خود ڈاکٹر صاحب نے اچھے اور سچے مسلمان اسی کے ساتھ اچھے اور سچے ہندوستانی ہونے کا عملی نمونہ پیش کر کے دکھایا۔

۱۹۶۰ء کے مسلم کنونشن کے بعد وہ برابر سوچتے رہے، کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو رہنا ہے، تو ان کو یہاں رہ کر کیا کرنا چاہئے، بہار، سی۔پی۔ اور یوپی میں فرقہ وارانہ فسادات کی تعداد بڑھتی جارہی تھی، جب کوئی بلوہ ہوتا، تو مسلمانوں کے کچھ رہنما موقع واردات پر پہونچ جاتے، وہاں کے خونی مناظر دیکھ کر متاثر ہوتے، ماتم کرتے، حکومت اور پولیس پر الزام رکھتے، بیانات شائع کرتے، اُن کے بیانات کی اشاعت سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوتا، بلکہ معاملات اور الجھ جاتے، مسلمانوں کا خوف دور ہونے کے بجائے ان پر اور ہراس طاری ہو جاتا، جو پاکستان جا سکتے تھے، وہ ہندوستان چھوڑ کر پاکستان چلے گئے، مگر چند خاندانوں کے پاکستان چلے جانے سے مسلمانوں کے دکھ درد کا علاج نہیں ہو سکتا تھا، ان کا کوئی ممتاز لیڈر بھی باقی نہیں رہا تھا، تقسیم کے بعد یہ سب کے سب پاکستان چلے گئے تھے، دہلی کی پارلیمنٹ اور ریاستوں کی قانون ساز مجلسوں میں جو مسلمان نمائندے تھے، وہ مشترکہ ووٹ سے منتخب ہوتے، اور کسی نہ کسی پارٹی سے وابستہ رہتے، اس لئے فرقہ واریت کے الزام سے

بچنے کی خاطر پارلیمنٹ یا قانون ساز مجلسوں میں ان بلووں کے مسئلہ کو اٹھانے سے گریز کرتے حتی کہ سوالات بھی نہ کرتے،

ڈاکٹر صاحب کا خیال تھا کہ جو اور مسلمان رہنما باقی رہ گئے تھے، وہ ملک کے بدلے ہوئے حالات میں اپنے کو بدلنے کو تیار نہیں تھے، اسی لئے انھوں نے ملک کے نئے دستور سے کوئی دلچسپی نہیں لی، جس وقت یہ دستور بن رہا تھا، اُن کو نڈر ہو کر اپنا نقطۂ نظر بھی پیش کرنا چاہیے تھا، صرف ماضی کی روایت پر فخر کرنا کوئی دانشمندی نہیں ہے یا جب دستور ہند بن گیا تھا، تو ان کو مل کر یہ فیصلہ کرنا تھا کہ اجتماعی حیثیت سے ملک میں ان کی کیا حیثیت رہے گی، وہ شریکِ حکومت بن کر رہیں گے، یا دوسرے درجہ کے شہری، وہ حربی ہیں، یا غلام، اگر وہ محض اقلیت میں ہیں تو اقلیت کی کیا حیثیت ہوگی، دستور ہند میں تو اُن کو شریکِ حکومت کا درجہ دیا گیا ہے، اب اُن کی ذمہ داری تھی کہ شریکِ حکومت بننے کی کوشش کرتے، ملک کے داخلی خارجی امور میں پوری دلچسپی لیتے، ہندوستان کی تعلیمی، اقتصادی اور تہذیبی تعمیرِ نو کے جو خاکے بنائے گئے اُنکی تراش خراش میں برابر کا حصہ لیتے، اگر اس میں کوئی چیز رکاوٹ بنتی تو اُس کا متحد ہو کر مقابلہ کرتے، ڈاکٹر صاحب مسلمان عوام سے بددل نہ تھے، کہتے کہ عام مسلمان ع ہکم کوش تو ہے لیکن بے ذوق نہیں راہی، وہ مسلمانوں کے خواص کے شاکی تھے، ان کی رائے تھی کہ اگر مسلمانوں کے رہنما مسلمان عوام کی صحیح رہنمائی کرتے، تو اس وقت ملک میں ان کی حیثیت کچھ اور ہوتی، ڈاکٹر صاحب اسی ادھیڑ بن میں تھے، کہ مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا محمد منظور نعمانی ان سے ملے اور ان سے اصرار کیا کہ مسلمانوں کے لئے کچھ ہونا چاہیے، ڈاکٹر صاحب نے ان سے کہا کہ تقسیم ہند کے بدلے ہوئے حالات میں مسلم رہنماؤں کا ذہن جس طرح بدلنا چاہئے تھا، وہ اب تک بدل نہیں سکا ہے، اور جب تک ان کا ذہن نہیں بدلے گا، مسلمانوں کے لئے جو بھی کام کیا جائے گا،

اس میں کامیابی نہ ہو گی، پھر بھی ان پر زور دیا گیا، تو انھوں نے تمام مختلف الخیال مسلمان رہنماؤں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کی تجویز پیش کی، اسی اثنا میں کلکتہ میں ایک بڑا فرقہ وارانہ فساد ہو گیا، وہ جماعت اسلامی کے امیر مولانا ابو اللیث صاحب "دعوت" کے اڈیٹر محمد مسلم صاحب اور مفتی عتیق الرحمن صاحب کے ساتھ کلکتہ گئے، اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد جمشید پور اور رورکیلا میں بھی زبردست فسادات ہوئے، ان بلوؤں سے متاثر ہو کر ڈاکٹر صاحب کو تمام مسلمان رہنماؤں کو جلد از جلد ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی اہمیت اور ضرورت کا اور بھی زیادہ احساس ہوا، اور ایک کنونشن طلب کرنے کی خواہش ظاہر کی، اس کے لئے انھوں نے جمعیۃ العلماء، جماعت اسلامی اور مسلم لیگ کے قائدین سے باتیں شروع کیں، جمعیۃ العلماء کی طرف سے مولانا اسعد میاں نے ڈاکٹر صاحب سے یہ کہا کہ جماعت اسلامی اور مسلم لیگ کے ساتھ جمعیۃ العلماء کیسے کام کر سکتی ہے، جب کہ یہ دونوں جماعتیں سیکولرزم اور ہندوستان کے دستور کو تسلیم نہیں کرتی ہیں، ڈاکٹر صاحب نے جماعت اسلامی کے امیر اور مسلم لیگ کے صدر کو لکھ کر اس بارہ میں اُن کے موقف کی وضاحت چاہی، مسلم لیگ کے صدر نے جواب دیا کہ اُن کی مسلم لیگ سنہ ۱۹۴۷ء کے پہلے کی مسلم لیگ کی شاخ نہیں ہے، بلکہ تقسیم کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی لیگ ہے، اُن کی جماعت سیکولرزم اور ہندوستان کے دستور دونوں پر اعتماد رکھتی ہے، جماعت اسلامی کے امیر کی طرف سے یہ وضاحت ہوئی کہ اُن کی جماعت بھی سیکولرزم اور ہندوستان کے دستور کو تسلیم کرتی ہے، لیکن اگر سیکولرزم کا مطلب یہ ہے کہ کسی مذہب کی پابندی نہ کی جائے اس کو بالکل چھوڑ دیا جائے تو میری جماعت اس کو تسلیم نہیں کرے گی، پنڈت جواہر لال نہرو نے سیکولرزم کا جو یہ مطلب

بتایا ہے کہ حکومت کا کوئی مذہب نہیں ہے، اسی کو میری جماعت تسلیم کرتی ہے، ڈاکٹر صاحب نے ان جوابات کو اخباروں میں شائع کر دیا، پھر بھی جمعیۃ العلماء کے مولانا اسعد میاں ان جوابات سے مطمئن نہیں ہوئے، مگر ایک نئی مجلس کی تاسیس کرنے کی ضرورت کا ساتھ دیا، اور اس میں شریک ہونے کے لئے رضامند ہو گئے، مولانا ابو الحسن علی ندوی، اور مولانا محمد منظور نعمانی بھی اس نئی مجلس کی تاسیس کے روحِ رواں بن گئے، اور مولانا ابو الحسن ندوی کی دعوت پر اس کنونشن کا اجلاس ۱۹۶۴ء میں ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ہوا، اس کے صدر ڈاکٹر صاحب منتخب ہوئے، اس میں جمعیۃ العلماء، جماعتِ اسلامی اور مسلم لیگ کے رہنماؤں کے علاوہ اور دوسرے ممتاز مسلمان بھی شریک ہوئے ڈاکٹر صاحب پر یہ خیال چھایا ہوا تھا کہ ہندوستان کے بدلے ہوئے حالات میں مسلمانوں کو ایک نئی راہ عمل اختیار کرنی چاہیے، اسی نئی راہِ عمل کی روشنی میں انھوں نے اپنا خطبہ لکھا، جس میں انھوں نے کہا:

"یہ خیال تھا کہ آزادی کے بعد ہمارے برادرانِ وطن جو تعلیم و دولت اور اثر و اقتدار میں ہم سے آگے بڑھے ہوئے ہیں، ذات پات کی تفریق اور فرقہ پرستی کی لعنتوں کو دور کرنے اور ملک کو یک جہتی بخشنے میں پورا حصہ لیں گے، لیکن بہت صفائی سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ سترہ سال کے بھی وہ اس مقصد کے حصول میں نہ صرف قطعی ناکام رہے ہیں، بلکہ یک جہتی اور میل ملاپ سے بہت دور جا پڑے ہیں، اس نئے ملک کے قدیم رشیوں، منیوں اور مسلمان صوفیائے کرام کی بھولی ہوئی روایات اور قرونِ وسطیٰ سے عظیم الشان ملک کو ایک کرنے کی کوششوں اور خدمات کی روایات کو ہمیں پھر سے زندہ

کرنا ہے یہ ہمارا عزم اور ارادہ جس کو لے کر ہم بڑھنا چاہتے ہیں، اس ذریعہ سے ہم
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی تعمیل کریں گے، تم ظالم کی بھی خدمت کرو
تاکہ اُس کو ظلم سے باز رکھ سکو، یہ کام جواب تک نہیں ہو سکا، اسے بہر حال انجام
پانا ہے، اور میری خواہش ہے کہ آپ بھی اس کا بوجھ اپنے سر لیں، یہ کام جس
کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے، ہمارے اندر قرون اولی کے مسلمانوں کی
یاد تازہ کر دے گا، اُس کے ذریعہ ہم اسلام و قرآن کا صحیح معنوں میں اپنے
اہل ملک سے تعارف کرا سکیں گے۔ اور بتا سکیں گے، کہ قرآن نے کس طرح
انسان کو موضوع بنا کر انسانیتِ عامہ کو اونچا اٹھایا، بے شک آپ کا دل
دکھا ہوا ہے لیکن یہی تو ایک مومن کے لئے امتحان کا وقت ہوتا ہے، کہ وہ
بغض و عداوت کے باوجود محبت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے"۔

خطبہ کے بعد کارروائی شروع ہوئی، جہاں اور تجویزیں منظور ہوئیں، وہاں ڈاکٹر
صاحب نے خاص طور پر حسب ذیل تجویز کی اہمیت بتا کر منظور کرائی،

"مسلمانوں کا یہ نمائندہ اجتماع اس امر کا تکلیف کے ساتھ اظہار کرتا ہے کہ
ہمارے برادرانِ وطن اس میں یکجہتی پیدا کرنے اور ملک کو حقیقی اتحاد کا نمونہ بنانے
میں ناکام رہے ہیں، یہ اجتماع مسلمانوں کو یاد دلاتا ہے کہ ان کا کام صرف
اپنے آپ کو سدھارنا اور اپنے بگاڑوں کو دور کرنا اور اپنی مشکلات کا مداوا
ڈھونڈنا ہی نہیں ہے بلکہ اسلام نے انھیں یہ تعلیم دی ہے کہ وہ ہر بگاڑ کو دور
کرنے میں لگ جائیں، اسی لئے یہ اپنوں اور دوسروں سے درخواست کرتا ہے
کہ وہ ملک کے اس اہم مسئلہ کو حل کرنا اپنی ذمہ داری سمجھیں، اور ملک اور یہاں کے

بسنے والوں میں اتفاق و اتحاد پیدا کرنے میں اپنی جان کی بازی لگانے میں دریغ نہ کریں قرآن مسلمانوں کو انسانیت کا بہی خواہ قرار دیتا ہے۔ اس لئے ان پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ ذات پات اور رنگ و نسل کا فرق دا تمیز کئے بغیر سب کے ساتھ حسن و سلوک کریں، یہ اجتماع مجلس عاملہ پر ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ اس اہم مقصد کے حصول کے لئے وہ مناسب تدابیر سوچ اور ان پر فوری عملدرآمد کرے، ویسے اکثریت کا فرض تھا کہ وہ اقلیتوں کا اعتماد حاصل کرتی، اور ان کی دل جوئی کرتی لیکن بد قسمتی سے اکثریت کی ایک قابلِ لحاظ تعداد مسلم اقلیت پر موہوم اسباب کی بنا پر بداعتمادی کا اظہار کرتی ہے، اس لئے مسلمانوں کے لئے اور بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اکثریت کے اس گروہ کے دلوں سے ان موہوم بدگمانیوں اور شکایتوں کو دور کرنے کی کوشش کریں تاکہ وطن عزیز کو امن و سکون حاصل ہو سکے، اور وہ تیزی کے ساتھ ترقی کی منزلوں پر گامزن ہو سکے"

یہ تجویز منظور ہوئی تو ڈاکٹر صاحب کو ایسا محسوس ہوا کہ انھوں نے ہندوستان کی صحیح خدمت ہندو مسلمان کو ایک دوسرے سے قریب تر اور مسلمانوں کو اس ملک میں سربلند کرنے کا جو ایک حسین خواب دیکھا تھا، اس کی تعبیر اب پوری ہوتی نظر آتی ہے، اس لئے اس تجویز کے منظور ہونے کے بعد انھوں نے ایک پُرجوش تقریر کی کہ یہ تجویز قطب مینار سے زیادہ بلند، لال قلعہ سے زیادہ مستحکم، تاج محل سے زیادہ خوبصورت اور اس ملک کی وسعت سے زیادہ وسیع ہے، اگر ہم اس پر عمل پیرا ہوئے، تو نہ صرف ہم اپنے اعلیٰ مقصد میں کامیاب رہیں گے، بلکہ بھیک کا ٹکڑا مانگے بغیر، ہم باعزت زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جائیں گے"

اسی جلسہ میں مجلسِ مشاورت کے نام سے ایک نئی مجلس کی تاسیس ہوئی جس کے ذریعہ مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کا قابلِ قدر اتحاد عمل میں آیا، ڈاکٹر صاحب نے اس پر زور دیا کہ اس مجلس کا مزاج احتجاجی نہ ہو، عوام کو اس کے لئے تیار کیا جائے، وہ نمایاں شخصیتوں سے زیادہ اصولوں اور مقاصد پر نظر رکھیں، وہ اپنے ملی مسائل کے ساتھ ملک کے عام انسانوں کی ضروریات کو بھی اپنے سامنے رکھیں، وہ کاسہ لیس ہونے کے بجائے یہ ثابت کر دکھائیں کہ اگر اپنی حکومت کے زمانہ میں انھوں نے عدلیہ اور انتظامیہ کی اچھی روایتیں قائم کی ہیں، اور تعمیرات و تعلیمات کے شعبوں میں عظیم الشان کارنامے انجام دیئے ہیں، تو پھر یہ سب کچھ وہ ملک کے بدلے ہوئے حالات میں بھی کر سکتے ہیں، اسی خود اعتمادی کا احساس ان میں پیدا کرنا ہے، اس کے لئے ہندوؤں میں گھس کر کام کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ اُن کی یہ غلط فہمی دور ہو جائے کہ مسلمانوں کو ملک سے حقیقی معنوں میں کوئی دلچسپی نہیں،

ڈاکٹر صاحب کے ان مخلصانہ جذبات کے باوجود مجلس مشاورت کی تشکیل پر ہندوؤں کے پریس میں بڑا شور ہوا، اور اس کے خلاف پروپگنڈا شروع کر دیا گیا، اس زمانہ میں لال بہادر شاستری وزیر اعظم تھے، ڈاکٹر صاحب لکھنؤ سے دہلی واپس ہوئے، تو مجلسِ مشاورت کے ایک وفد کے ساتھ ان سے ملے، اور جو مذکورۂ بالا تجویز مجلس میں منظور ہوئی تھی، اس کو دکھا کر اُن سے کہا کہ اس مقصد کی تکمیل کے لئے مجلس کے اراکین ملک کا دورہ کریں گے،

ڈاکٹر صاحب اس بڑھاپے میں اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر پھر سے جوان ہو گئے، مجلس کے اور ممتاز رہنماؤں کے ساتھ یو، پی، بہار، بنگال، گجرات، بمبئی، وغیرہ کے مختلف شہروں میں گئے، پنڈت سندر لال بھی اس وفد کے ساتھ رہے، جہاں

جلسہ ہوتا، اُس کا صدر وہاں کا کوئی ممتاز ہندو بنایا جاتا، یہ وفد جہاں جاتا، اُس کا شاندار خیر مقدم کیا جاتا، جلوس نکالا جاتا، ڈاکٹر صاحب کو اس جلوس کے ساتھ کہیں کہیں دو تین میل پیدل چلنا پڑتا، مگر وہ اپنی ضعیفی اور جسمانی معذوریوں کے باوجود اس کے ساتھ خوشی خوشی چلتے رہتے، دن رات میں کئی کئی تقریریں کرتے، کہتے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے خلافت کی تحریک اور ترک موالات کا زمانہ پلٹ آیا ہے، اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں :-

"مجلس مشاورت کی تشکیل اور مذکورۂ بالا تجویز کے اخبارات میں اعلان کے بعد اس کا جس طرح خیر مقدم کیا گیا اس سے میں خود متحیر رہا ہوں، میں نے کانگریس کے پلیٹ فارم سے ہندو مسلم مسئلہ پر ہمیشہ تقریریں کیں، اس سلسلہ میں مختلف تحریریں بھی لکھتا رہا، مگر ان کا کوئی خاص اثر نہ ہوا، لیکن مجلس مشاورت اور مذکورۂ بالا تجویز کا جو اثر ہوا وہ میری توقع سے بہت زیادہ تھا، اس کے دو وجوہ تھے، ایک یہ کہ عام مسلمان لڑائی جھگڑے اور مارپیٹ سے تھک گئے تھے، اور اب امن کی زندگی کے خواہاں تھے، دوسرے مسلمانوں کی بہت سی پارٹیاں مجلس مشاورت میں مل گئی تھیں، (عزائم ۳۰ مئی ۱۹۷۰ء)

اسی اثنا میں ایک سفر سے واپس ہو کر وزیر اعظم لال بہادر شاستری سے ملے اور مجلس کی سرگرمیوں کا ذکر اُن سے کیا، تو انھوں نے کہا کہ آپ کی ذات پر مجھے پورا اعتماد ہے اس لئے جو طریقۂ کار آپ کا ہوگا وہ صحیح ہوگا، ایک موقع پر جب مجلس کا وفد بمبئی کا دورہ کر رہا تھا تو شاستری جی بھی وہاں گئے ہوئے تھے، انھوں نے اپنی ایک تقریر میں ایک سوال کے جواب میں مجلس کے متعلق کہا کہ "اس کے اراکین اچھا کام کر رہے ہیں، ان کے کاموں سے مجھے پورا اتفاق ہے" انگریزی اخبارات کو مجلس مشاورت کی طرف سے ایسا

بدظن کر دیا گیا تھا کہ وزیر اعظم کا یہ بیان کسی انگریزی اخبار میں نہیں چھپا، لیکن وہاں کے ایک مراٹھی اخبار میں شائع ہوا، مجلس کی مفید کارروائیوں کی خبریں انگریزی اخبارات میں بلیک آوٹ ہوتی رہیں، اس لئے عام ہندوؤں کو اس کی سرگرمیوں کی خبر نہیں ہوئی، صرف انہی ہندوؤں کو ان کا علم ہوا، جو اس کے جلسوں میں شریک ہوتے، ڈاکٹر صاحب اپنی تقریروں میں مسلمانوں کو رواداری اور فراخ دلی کی تلقین ان کی اسلامی تاریخ کے واقعات کا حوالہ دے کر کرتے، مثلاً ایک موقع پر بیان کیا کہ تاریخ اسلام کا یہ روشن واقعہ ہے کہ مروان نے ایک مسجد بنوائی، بیچ میں ایک گرجا تھا، جس کو گرا کر یہ مسجد مکمل کی گئی، عیسائیوں سے کہا گیا کہ زمین کا عوض اور قیمت لے لو، مگر وہ نہیں مانے، حضرت عمرؓ بن عبد العزیز کے زمانے میں عیسائی ان کے پاس آئے، اور کہا کہ ان کے ساتھ جو ظلم کیا گیا ہے اس کا انصاف کیا جائے، حضرت عمرؓ بن عبد العزیز نے بھی ان کو معاوضہ قبول کرنے کو کہا، مگر وہ راضی نہ ہوئے، حضرت عمرؓ بن عبد العزیز نے ان کی دلجوئی اور انصاف پروری ہی کی خاطر ان سے کہا جا کر مسجد گرا دو اور گرجا از سر نو بنا لو، عیسائیوں نے کہا کہ اس کی جرأت کون کر سکتا ہے، پھر تو حضرت عمرؓ بن عبد العزیز خود پھاوڑا لے کر چلے، عیسائی یہ منظر دیکھ کر حیران ہو گئے، اور یہ کہہ کر معاوضہ قبول کرنے پر رضامندی ظاہر کی کہ "ہم یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ کوئی ایسا مسلمان ہے جو یہ جرأت کرے"، پھر ہندوؤں کو مسلمانوں سے قریب کرنے کی خاطر ان کو بتاتے کہ مسلمانوں نے اپنے دورِ حکومت میں ہندوؤں کے ساتھ ہر طرح کی رعائتیں کیں، ان کے ساتھ اچھا سلوک کرتے رہے، انھوں نے ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کے ترجمے کرائے جس سے وہ ہر خاص و عام تک پہونچیں، ورنہ ان کو صرف برہمن ہی پڑھتے تھے، انھوں نے مندروں کے لئے جائدادیں وقف کیں، میسور میں شاید ہی کوئی

ایسا مندر ہو جس میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان کا دیا ہوا چاندی یا سونے کا کوئی تحفہ نہ ہو، شنکر اچاریہ کے مٹھ کے لئے ٹیپو سلطان نے ایک سونے کی گراں قدر پالکی دی تھی، جب ہندوستان کے پہلے صدر جمہوریہ بابو راجندر پرشاد وہاں گئے تو اس پر سوار ہوئے، اس قسم کے اور واقعات بیان کر کے ہندوؤں کے سامنے مسلمانوں کا سر اونچا کرتے، پھر اُن کی حب الوطنی کے سلسلہ میں اپنی تقریروں میں کہتے کہ ۱۷۵۷ء سے ۱۸۵۷ء تک تو صرف مسلمان ہی انگریزوں سے برسر پیکار رہے ۱۸۵۷ء میں ہندو پہلی بار مسلمانوں کے ساتھ شریک ہوئے، اس قسم کی تقریریں سن کر غیر مسلم کہتے کہ ہم مسلمانوں کی تاریخ کے ان پہلوؤں سے بالکل ناواقف ہیں، اُن کو سامنے لانے کی ضرورت ہے، وہ اپنی تقریروں میں ہندو سبھیتا اور سنسکرتی کے روشن پہلوؤں کے حوالے بھی دیا کرتے تھے،

ڈاکٹر صاحب کی ان کوششوں کے باوجود حکومت ہند کے بعض وزراء کو کچھ غلط فہمی پیدا ہو گئی، اور مجلس مشاورت کی مقبولیت کو مشکوک نظروں سے دیکھنے لگے، ان ہی میں مرارجی ڈیسائی تھے، دہلی میں مولانا اسعد میاں کے ایک طلب کردہ جلسہ میں ڈاکٹر صاحب کی ملاقات مرارجی ڈیسائی سے ہوئی جنھوں نے مجلس مشاورت کا ذکر کچھ ایسے الفاظ کے ساتھ کیا کہ ڈاکٹر صاحب سے ایک ٹکر ہو گئی، انھوں نے اُن کو سخت جواب دیا، اس سلسلہ میں دونوں میں ناگوار خط و کتابت بھی ہوئی، مگر مسٹر تلسی ڈیسائی، ایم پی نے ڈاکٹر صاحب کی حمایت کی، وہ شولاپور کے مشہور کانگریسی لیڈر ہیں، آزادی کی جنگ کے زمانہ میں اُن کو پھانسی کی سزا دی گئی تھی، لیکن نہیں دی جا سکی، وہ شولاپور کی مجلس مشاورت کے ایک جلسہ کی صدارت بھی کر چکے تھے، انھوں نے ڈاکٹر صاحب کی بے تعصبی کے سلسلہ میں ان کی ان تقریروں کے حوالے دیے جن میں ہندو سبھیتا اور سنسکرتی کے

روشن پہلو پیش کیا کرتے تھے، (عزائم، ۲۸ مئی ۱۹۷۱ء، ص ۹)

ان سرگرمیوں کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کی کوشش یہ بھی رہی کہ اس مجلس کے ذریعہ ان جدید مسائل کا حل بھی نکالا جائے، جن سے مسلمان اس جدید زمانہ میں دوچار ہو رہے ہیں، مثلاً بینک کے سود کے جائز و ناجائز ہونے کے متعلق کوئی متفقہ فیصلہ کیا جائے، اس کے لئے ایک کمیٹی بھی بنائی گئی، اُن کی خواہش یہ بھی رہی کہ مسلمانوں کے معاشرتی، تعلیمی اور اقتصادی حالات کو درست کرنے کے لئے قدم اٹھائے جائیں، چنانچہ بہت سی مفید تجویزیں پیش ہوئیں، ایک جامع سوالنامہ تیار کر کے کوشش کی گئی، کہ ہر گاؤں اور ہر ضلع سے کچھ ریکارڈ جمع کئے جائیں، اور اُن کے مطابق وہاں کے مسائل حل ہوتے رہیں، اور ہر علاقہ میں ایک اجتماعی قیادت پیدا کی جائے، جو تمام معاملات سے نپٹنے میں پیش پیش ہو تعمیری کام کرنے والے لوگ سامنے لائے جائیں، اور دوسرے تیسرے درجہ کی قیادت ہر علاقہ میں ابھاری جائے، تاکہ وہ آگے چل کر صف اوّل میں آ جائے، اسی طرح کی اور مفید تجویزیں پیش ہوتی رہیں، مگر ان چیزوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایک مضبوط مرکزی دفتر اور مخلص کارکنوں کی ضرورت تھی، جو پوری نہ ہو سکی، پھر بھی ۱۹۶۴ء اور ۱۹۶۷ء کے درمیان مجلس مقبول ہوتی چلی گئی،

فروری ۱۹۶۵ء میں دارالمصنفین کی پچاس سالہ طلائی جوبلی ہوئی، تو اس کی ساری تقریبات ڈاکٹر صاحب ہی کی صدارت میں انجام دی گئیں، کیونکہ وہ اس کی مجلس انتظامیہ کے صدر تھے، یہ جشن بہت ہی تزک و احتشام سے منعقد ہوا، دارالمصنفین اور شبلی کالج کے احاطے خیمہ و خرگاہ سے پُرشکوہ ہو گئے تھے، رات کے وقت روشنی سے شبلی منزل دولھن کی طرح آراستہ نظر آتی تھی، ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اس وقت نائب صدر جمہوریہ تھے،

انھوں نے اس کی رسم افتتاح انجام دی، بکثرت مہمان آئے جن میں بیگم صاحبہ بھوپال، مسز سوچیتا کرپلانی وزیر اعلیٰ یوپی، سعودی عرب کے سفیر اور پاکستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر کے ساتھ ملک کے ممتاز علماء، صلحاء، ادیب اور شعراء بھی تھے، تمام تقریبات بہت ہی خوش اسلوبی سے انجام پاگئیں، علمی مجلس مذاکرہ بھی منعقد ہوئی جس میں اچھی اچھی تقریریں ہوئیں، بلند پایہ مقالات بھی پڑھے گئے، ایک سنجیدہ مشاعرہ بھی ہوا، کھلانے پلانے میں میزبانی کے فرائض بھی سلیقہ سے پورے کئے گئے، اس موقع پر پونے دو لاکھ کے عطیات بھی ملے، ڈاکٹر صاحب اس تقریب سے بے حد خوش رہے، بار بار مجھ کو گلے لگا کر میری حوصلہ افزائی کرتے، جناب شاہ معین الدین صاحب ندوی کو اور دارالمصنفین کے تمام لوگوں کو فرداً فرداً مبارکباد دیتے، اور آخر وقت تک کہتے رہے کہ یہ جوبلی ہر لحاظ سے شاندار رہی، اُن کی یہ خوشی اس قلبی لگاؤ کی بنیاد پر رہی جو اُن کو اس ادارہ سے تھی۔

۱۹۶۵ء ہی میں مسلم یونیورسٹی کے متعلق مرکزی حکومت میں ایک آرڈیننس آنے والا والا تھا، جس کے متعلق یہ افواہ تھی کہ اس کا اقلیتی کردار ختم کر دیا جائے گا۔ اس زمانہ میں عبد الکریم چھاگلا وزیر تعلیم تھے، انھوں نے کچھ ایسی ناخوشگوار تقریر کر دی تھی، جس سے مسلمانوں کو دکھ پہنچا تھا، اور ڈاکٹر صاحب کے متعلق بھی کچھ ایسی باتیں کہہ دی تھیں جو صحیح نہیں تھیں، ڈاکٹر صاحب نے اُن کا سخت جواب دیا اس طرح دونوں میں تلخی پیدا ہو گئی، اس وقت وزیر اعظم لال بہادر شاستری تھے، ڈاکٹر صاحب ۱۹ اگست ۱۹۶۵ء میں پارلیمنٹ کے بیس مسلمان ممبروں کا ایک وفد لے کر اُن کے پاس گئے، بحث و مباحثہ کے بعد لال بہادر شاستری نے وفد کو یہ کہکر یقین دلایا کہ

"مسلم یونیورسٹی کے آئندہ بل میں آرڈیننس کے جاری ہونے سے پہلے کی طرح

"مسلمان طلبہ، مسلمان اساتذہ اور کورٹ کے مسلمان اراکین کی بھاری اکثریت باقی رہیگی"

اس کے بعد انھوں نے وفد سے پوچھا کہ آپ میرے اس بیان سے مطئمن ہوئے کہ نہیں یا آپ یہ چاہتے ہیں کہ مسلم یونیورسٹی میں کوئی بھی ہندو نہ ہو، وفد نے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ایک آواز سے کہا کہ ہم کو آپ کے وعدہ سے پورا اطمینان ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے وفد کی طرف سے یہ بھی کہا کہ مسلم یونیورسٹی کے بانی کی خواہش اور یونیورسٹی کے دستور کے خلاف یہ بات ہوگی اگر وہاں غیر مسلم نہ ہوں، جہاں تک اساتذہ اور طلبہ کا تعلق ہے یونیورسٹی کے ابتدائی دور میں بھی ہندوؤں کے لئے کوئی روک ٹوک نہیں تھی، مشہور راجہ مہندر پرتاب جو برطانوی راج کے بہت بڑے مخالف تھے، علی گڈھ اسکول اور کالج ہی کی پیداوار ہیں، یہ گفتگو چل رہی تھی کہ مسٹر چھاگلا بلائے گئے، اور تھوڑی بحث کے بعد یہ قرار پایا کہ یونیورسٹی کا بل جلد از جلد پیش کر دیا جائے گا، اس کے بعد سید احمد صاحب ایم۔ پی نے یہ تجویز پیش کی کہ ڈاکٹر صاحب اور مسٹر چھاگلا دونوں ایک دوسرے سے ہاتھ ملائیں، لال بہادر شاستری نے بھی خوش ہو کر اس کی تائید کی، دونوں نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا، اس کے چند دنوں کے بعد ہی ڈاکٹر صاحب نے لال بہادر شاستری کو شکریہ کا ایک خط لکھا، اور اُن سے اجازت مانگی کہ انھوں نے علی گڈھ کے متعلق جو وعدے کئے ہیں اُن کو وہ شائع کر دیں، انھوں نے اس کے جواب مورخہ ۳۱ ر اگست ۱۹۶۵ء میں ڈاکٹر صاحب کی خواہش کو رد نہیں کیا اور امید دلائی کہ علی گڈھ کا معاملہ سلجھ کر ختم ہو جائے گا، مگر ستمبر میں ہندوستان اور پاکستان میں جنگ ہو گئی، جس کے بعد لال بہادر شاستری کی وفات ہو گئی، اُن کے زمانہ میں علی گڈھ کے متعلق کچھ نہ ہو سکا، ڈاکٹر صاحب کا بیان ہے کہ وہ ایک بہت ہی بہتر انسان تھے، ان کا انکسار بڑا دلپذیر تھا، جو وعدہ کرتے پورا کرتے، افسوس کہ

اُن کی عمر نے وفا نہ کی، ڈاکٹر صاحب نے یہ ساری باتیں اس مضمون میں بھی لکھی تھیں جو انھوں نے مسز اندرا گاندھی کے ۱۹۷۱ء کے انتخاب میں اُن کی حمایت میں "وطن دوستوں سے اپیل" کے عنوان سے شائع کیا تھا،

ڈاکٹر صاحب خوش تھے کہ ان کی مجلس مشاورت مفید اور مقبول ہوتی جارہی ہے لیکن ۱۹۶۷ء کا عام انتخاب کا زمانہ آیا، تو بقول ان ہی کے اس کے لئے پیام اجل آگیا، ڈاکٹر صاحب کی اصلی خواہش تھی کہ انتخاب میں مجلس مشاورت کوئی حصہ نہ لے، بلکہ اپنے کاموں اور اصلی مقصد کی تکمیل میں لگی رہے لیکن عام مسلمانوں کو اس جمہوری حق کے استعمال سے روکنا بھی ممکن نہ تھا، یہ بے معنی بھی ہوتا، مجلس مشاورت میں شریک ہونے والی پارٹیوں کا مسلک الگ الگ تھا، جو اپنے طور پر انتخاب میں حصہ لینا چاہتی تھیں، ان سب کا ساتھ دینا بھی مناسب نہ تھا، اس لئے غور و خوض کے بعد مجلس مشاورت کی طرف سے یہ طے کیا گیا کہ عوام کو صرف اتنا مشورہ دیا جائے کہ وہ بہترین آدمی کو اپنا ووٹ دیں، اس کے لئے ایک جامع اور متوازن منشور تیار کیا گیا لیکن ڈاکٹر صاحب کا بیان ہے کہ بعد میں اُن کی مرضی کے خلاف اس میں ایک پیراگراف ایسا بڑھا دیا گیا، جو کانگریس، اور کانگریسی حکومتوں کی شکایتوں اور دھمکیوں سے پُر تھا، منشور کا یہ جزو سم قاتل بن گیا، کیونکہ ڈاکٹر صاحب کے خیال کے مطابق یہ لکھنؤ کے کنونشن کے اس اصول کے خلاف تھا کہ کسی کی شکوہ شکایت نہ کی جائے گی، اس منشور کی اشاعت کے بعد پھر وہی شکوہ شکایت کی فضا بن گئی، جس کو ختم کرنے کے لئے مجلس مشاورت بنی تھی، کانگریس اور اس کی حکومت مجلس مشاورت سے بدظن ہو گئی، ڈاکٹر صاحب کی رائے کے مطابق مجلس مشاورت نے گذشتہ دو سال کے اندر جو کام کیا تھا، اس کا اثر جاتا رہا، اور

یہ مجلس الیکشن کی سرگرمیوں کی نذر ہوگئی، ڈاکٹر صاحب بد دل ہوئے، اور کچھ دنوں کے بعد اس سے مستعفی ہوگئے، ان کی علٰحدگی سے مجلسِ مشاورت بے جان ہو کر رہ گئی، اس بد دلی کے زمانہ میں ایک بار لکھنؤ سے اعظم گڈھ آئے، تو کہنے لگے، کہ مجلسِ مشاورت کے رُخ بدل جانے سے مجھ پر اتنا اثر ہے کہ کہیں ایک روز میرے قلب کی حرکت بند نہ ہو جائے، اپنی گفتگوؤں اور تحریروں میں اس کا اظہار برابر کیا، کہ مجلسِ مشاورت کی ناکامی میری زندگی کا ایک بڑا المیہ ہے جس پر مجھ کو ہمیشہ دکھ رہے گا، انھوں نے اس ناکامی کے اسباب پر بہت ہی طویل مضمون لکھنؤ کے ہفتہ وار اخبار عزائم مورخہ ۲۰ مئی سنہ ۱۹۷۱ء میں "رودادِ چمن" کے عنوان سے لکھا ہے، ممکن ہے کہ اس کی بہت سی باتوں سے ان کے دوسرے رفقائے کار کو اتفاق نہ ہو لیکن مجلس کی ناکامی کے جہاں اور اسباب ہو سکتے تھے، وہاں ایک بڑا سبب ڈاکٹر صاحب ہی کے خیال کے مطابق یہ تھا کہ محدود وفاداریوں سے مجلسِ مشاورت کی اکثر جماعتیں اور شخصیتیں باہر نہیں نکل سکیں، اجتماعی لیڈرشپ کو جو کچھ دینا چاہیے تھا، وہ جماعتی لیڈرشپ سے کچھ آگے کی بات ہونی چاہیے تھی، مگر مجلس کے لوگ ان دائروں سے آگے بڑھ کر مشترک مسائل کے لئے کھل کر کام نہ کر سکے، چنانچہ کوئی ایسا ٹھوس کارنامہ روبہ ظہور نہ آسکا، جو دیرپا اثرات چھوڑتا، اور وہ قوت جو جمع تھی، وہ کسی اور رُخ نہیں موڑ سکی،

(رسالہ دوام، جون، جولائی سنہ ۱۹۷۱ء ص ۸)

مجلس مشاورت کی ناکامی پر ڈاکٹر صاحب کو اپنی زندگی کے آخری لمحات تک بڑا دکھ رہا، اُن کی زندگی کی جو آخری تحریر ہے اس میں لکھتے ہیں:-

مجلسِ مشاورت جس مقصد کے لئے قائم کی گئی تھی اس کی ناکامی پر مجھ کو از حد

رنج ہے، میں اس بڑھاپے اور اپنی جسمانی معذوریوں کے باوجود اس کو لے کر اٹھا تو لیڈری کی خواہش نہ تھی کسی عہدہ کا طلب گار نہ تھا، حکومت کو ڈرا دھمکا کر اپنے لئے کوئی اعزاز نہیں چاہتا تھا لیکن مسلمانوں اور ملک کی خدمت کا جذبہ ضرور تھا، ان سطور کو لکھتے وقت بھی یہ جذبہ کار فرما ہے کہ مسلمان ہندوستان میں سربلند اور باعزت بن کر رہیں، لیکن اب سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کو کیا طریقۂ کار اور لائحۂ عمل اختیار کرنا چاہئے، وہ سربلندی اور عزت کس طرح حاصل کرسکتے ہیں، سطحی جذبات کو ابھار کر ان کو لے کر آگے بڑھا جائے یا ان کی قومی، معاشرتی اور ملی زندگی کی بنیاد کو مستحکم بنا کر آگے لے جایا جائے

تن آسانیاں چاہیں اور آبرو بھی
وہ قوم آج ڈوبے گی جو کل نہ ڈوبی"

وہ سیاسیات سے کنارہ کشی کا فیصلہ کر چکے تھے کہ جون ۱۹۶۷ء میں یہودیوں اور عربوں سے جنگ چھڑ گئی، اور تین چار روز میں عربوں کی پسپائی ہو گئی، تمام دنیا میں ایک تہلکہ مچ گیا، مصر کے صدر جمال عبدالناصر کے سیاسی وقار کو سخت صدمہ پہونچا، خود ہندوستان کو عربوں کی اس شکست سے دکھ ہوا، ہندوستانی مسلمان بھی ملول خاطر ہوئے، انھوں نے عربوں سے ہمدردی ظاہر کرنے کے لئے ۱۲، ۱۳ اگست ۱۹۶۷ء کو ایک فلسطین کانفرنس منعقد کی، صدارت کے لئے مسلمانوں کے قائدین کی نظر ڈاکٹر صاحب ہی کی طرف اٹھی، سیاست سے علٰحدگی کے باوجود اپنے اسلامی جذبات سے متاثر ہو کر یہ صدارت قبول کر لی، اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ انڈو عرب فرینڈشپ سوسائٹی کے صدر بھی تھے اتفاق سے ان ہی دنوں میں بھی دہلی میں تھا، کانفرنس میں مسلمانوں کا بڑا اچھا اجتماع تھا،

ہندوستان کے تمام گوشوں سے مسلمان نمائندے بھی آئے مختلف جماعتوں کے تمام مسلمان رہنما بھی شریک ہوئے، پھر مصر، شام، لبنان، عراق، اردن، کویت، الجیریا، لیبیا اور سعودی عرب کے سفراء بھی مدعو تھے، میں نے اُن ہی کے جھرمٹ میں ڈاکٹر صاحب کو صدارت کرتے دیکھا، ان کا خطبہ اسلامی جذبات سے بھرا ہوا تھا، وہ خود تو پڑھ نہیں سکتے تھے، دہلی کے ہفتہ وار اخبار ریڈینس کے منیجنگ اڈیٹر صدیقی صاحب نے اس کو پڑھ کر سنایا، بڑے غور سے تالیوں کی گونج میں سُنا گیا،

اجلاس ختم ہوا تو سفراء نے ڈاکٹر صاحب کو گھیر لیا، ڈاکٹر صاحب نے ان سے فرمایا کہ میں تو بوڑھا ہو کر ختم ہو چکا ہوں لیکن آپ لوگوں کے لئے دعا گو ضرور ہوں، میں نے سعودی عرب کے سفیر کو اُن سے کہتے ہوئے سُنا "ڈاکٹر صاحب! آپ اپنے متعلق جو کچھ کہیں لیکن آپ کا جیسا آدمی بھی ہمارے پورے سعودی عرب میں کوئی نہیں"،

ڈاکٹر صاحب کو اچھے نصاب تعلیم سے شروع سے دلچسپی رہی، ان کا خیال تھا کہ نصاب تعلیم اگر مرکزی حکومت کی طرف سے تیار ہوتا رہتا، تو اس میں افراتفری نہ پیدا ہوتی، مگر نصاب کا تیار کرانا صوبائی حکومتوں پر چھوڑ دیا گیا، جن کی غلطیوں سے پرائمری اور سکنڈری اسکولوں کی نصابی کتابوں میں بہت سی غلط چیزیں آگئیں جن سے ایک مشترکہ کلچر کی اسپرٹ پیدا ہونے کے بجائے اس کے خلاف ردعمل ہوا، ڈاکٹر صاحب نے نصاب کے مضرت رساں پہلوؤں کی طرف عبدالکریم چھاگلا صاحب کو توجہ بار بار دلائی، لیکن کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوا، پھر ڈاکٹر صاحب کی خواہش ہی پر مصطفےٰ رشید شروانی صاحب (مالک جیپ کمپنی الٰہ آباد) نے وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کو نصاب کی بعض کتابیں دکھلائیں، ان کو یہ کتابیں دیکھ کر دکھ ہوا، اور وہ خود راجیہ سبھا میں یہ کتابیں لے گئیں، اور چھاگلا صاحب

کو پڑھ کر سُنانے کو کہا، ارکین سُن کر حیران ہوئے، اسی کے بعد نصاب کی اصلاح کے لئے ایک کمیٹی بنی، اُس نے حکومت کو اپنی رپورٹ بھی پیش کی، مگر اُس کی سفارشات پر عمل کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی، ڈاکٹر صاحب نے اس سلسلہ میں راؤ صاحب کی وزارتِ تعلیم کے زمانہ میں اُن کو ایک خط لکھا، لیکن انھوں نے اس کا جواب تک نہیں دیا، حالانکہ ڈاکٹر صاحب کا بیان ہے کہ وزیر ہونے کے پہلے وہ برابر اُن کی خوشامد میں لگے رہتے، ڈاکٹر صاحب کا یہ بھی خیال تھا کہ راؤ وزیرِ تعلیم کی حیثیت سے ایک غلط آدمی تھے، وہ مسز اندرا گاندھی کی پالیسیوں کو نقصان پہنچانا چاہتے تھے، اندرا گاندھی ان کو وزیرِ تعلیم اسی لئے بنائے ہوئی تھیں، کہ ان کو کوئی اور مناسب آدمی نہیں ملا تھا،

(رسالہ دو ام جون، جولائی ۱۹۷۱ء ص ۱۲)

مجلسِ مشاورت سے ان کی سرگرمیاں جاتی رہیں، تو وہ اپنے فارم کی طرف زیادہ متوجہ ہوئے، ان کے پاس ایک ہزار بگھے سے زیادہ کھیت تھے، اتنی بڑی کھیتی ان سے سنبھل نہیں سکتی تھی، اس لئے کھیتوں کو فروخت کرنے لگے، اس سلسلہ میں اعظم گڈھ برابر آتے دارالمصنفین ہی میں قیام رہتا، ان کی میزبانی میں مجھ کو لطف ملتا، دسترخوان پر جو چیز بھی آجاتی اپنی محبت و شفقت سے اس کی تعریف کرکے بڑی رغبت سے تناول فرماتے، اُن کے آنے کی وجہ سے میرا دن بھی بڑا خوشگوار گذرتا، وہ رات کو بہت دیر کرکے سونے کے عادی تھے، میں ایک بجے رات تک اُن کے پاس بیٹھا رہتا، وہ ہر قسم کی باتیں کرتے، اُن کا موضوع علمی، ادبی، تاریخی، مذہبی، اور سیاسی سب کچھ ہوتا، جب وہ اپنی سیاسی زندگی کی یادوں کا چراغ روشن کرتے، تو مجھ کو اس میں زیادہ لذت ملتی، اس سلسلہ میں انھوں نے وقتاً فوقتاً جو مجھ کہا کاش ان کو میں قلمبند کرتا رہتا، مگر وہ برابر کہتے رہتے کہ دارالمصنفین میں کچھ دنوں رہ کر ان سب باتوں کو قلمبند

کرادوں گا، اسی لئے میں ان کو لکھ نہ سکا، پھر بھی جو باتیں حافظہ میں رہ گئی ہیں، ان کو بڑی لذت کے ساتھ ان اوراق میں لکھتا چلا آرہا ہوں، کچھ اور باتیں بھی ہیں، یہ ناظرین ہیں،

وہ گاندھی جی کی سیاسی عظمت و بصیرت اور اُن کی اخلاقی قدروں اور خوبیوں کے بہت قائل تھے، ان کا حوالہ بات بات پر دیتے، گاندھی جی بھی اُن کو بہت عزیز رکھتے،

وہ ۲۱-۱۹۲۰ء کے ترک موالات اور خلافت کی تحریکوں کو بہت ہی لطف و لذت سے یاد کرتے، جب کہ ہر جگہ ہندو مسلمانوں کی یگانگت و موانست کے بڑے روح پرور نظارے دیکھنے میں آتے تھے، اس زمانہ میں گاندھی جی مسلمانوں کے بھی متفقہ لیڈر تسلیم کئے جاتے تھے، مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی تو ان پر اپنے کو قربان کرنے کے لئے تیار رہتے، ہندو مسلمانوں کا یہ اتحاد انگریزوں کو پسند نہ آیا، اور وہ اس کو اپنے لئے بہت ہی خطرناک سمجھنے لگے، ڈاکٹر صاحب کا بیان ہے کہ اسی زمانہ میں انگلستان سے لارڈ نارتھ کلف ہندوستان آئے ہوئے تھے، وہ انگلستان کے صحافتی حلقوں میں بڑا اثر رکھتے تھے، اخباری پروپیگنڈے کے بڑے ماہر سمجھے جاتے تھے، پہلی جنگ عظیم میں ان ہی کے پروپیگنڈے سے جنگ کا رُخ بدل گیا، ہندوستان میں اُن کی آمد پر ٹائمس آف انڈیا کے اڈیٹر مسٹر اسٹینلی ریڈ کا ایک پیام ڈاکٹر صاحب کے یہاں پہنچا، کہ لارڈ ناتھ کلف اُن سے بمبئی میں ملنا چاہتے ہیں، جب دونوں میں ملاقات ہوئی، تو لارڈ نارتھ کلف اپنے ماہرانہ انداز میں خلافت کی تحریک پر گفتگو کرنے لگے، جس کا منشا یہ تھا کہ مسلمان گاندھی جی کی قیادت پر زیادہ بھروسہ نہ کریں، اس سلسلہ میں انھوں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا "مسلمان اور انگریز دونوں پروپیگنڈے کی اہمیت سے واقف نہیں ہیں"، ڈاکٹر صاحب نے ہنس کر ان کو جواب دیا "آپ کے منھ سے یہ بات سُن کر تعجب ہوا کیونکہ جرمن تو یہ کہتے ہیں کہ اُن کو برطانوی فوج سے ہار نہیں ہوئی، بلکہ

لارڈ نارتھ کلف کے پروپگنڈے سے شکست ہوئی" لارڈ نارتھ کلف یہ سُن کر ہنسے اور بولے نہیں تو پروپگنڈا کرنا جانتا ہوں لیکن میری قوم نہیں جانتی ہے، ہندو بھی پروپگنڈے کی اہمیت سے واقف ہوگئے ہیں، اور وہ پروپگنڈا کرنا خوب جانتے ہیں" اسی کے ساتھ انھوں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ "گاندھی کو زیادہ نہ بڑھائیے، ان کی قیادت کے پیچھے نہ جائیے"۔ ڈاکٹر صاحب کو گاندھی جی سے جو محبت تھی، اس بنا پر ان کو یہ بات ناگوار گزری، اور انھوں نے جذباتی انداز میں کہا "گاندھی جی ہمارے لیڈر ہیں"، لارڈ نارتھ کلف چیخ اٹھے، "آپ کے لیڈر کیسے ہو سکتے ہیں، آپ تو مسلمان ہیں، اور وہ ہندو ہیں"، ڈاکٹر صاحب کو یہ بات بھی ناگوار ہوئی، اور فوراً بول اٹھے، "مائی لارڈ! آپ یہ کہتے وقت بھول رہے ہیں کہ میں ہندوستانی بھی ہوں" یہ سُن کر لارڈ نارتھ کلف جزبز ہوئے، اور بولے "یاد رکھئے انگریز جب ہندوستان سے چلے جائیں گے تو ہندو مسلمانوں کو پیس ڈالیں گے، اس وقت مسلمان مضطرب ہو کر انگریزوں کو واپس چلے آنے کا تار بھیجیں گے"۔ . . . . . ڈاکٹر صاحب نے ان کو یہ جواب دے کر خاموش کیا، "آپ مطمئن رہیں آپ کے پاس ایسا کوئی تار نہیں جائے گا"

ڈاکٹر صاحب نے ایک سلسلۂ کلام میں ایک روز کہا کہ ۳۱-۱۹۳۰ء میں انھوں نے ملک کا دورہ کیا، اور نیشنلسٹ مسلمانوں کی جابجا کمیٹیاں قائم کیں، تاکہ جنگ آزادی لڑنے کے ساتھ ہندو مسلمانوں کو ایک دوسرے سے قریب تر کریں، ان کی ان کوششوں کی داد ہر طرف سے ملی، اخباروں میں تعریف چھپتی رہی، جس سے بقول اُن کے اُن کا نفس بھی موٹا ہوتا گیا، اور جب انھوں نے اپنی ان سرگرمیوں کا حال گاندھی جی کو لکھا تو ان سے داد پانے کے بجائے یہ جواب پایا کہ تم ابھی داد پانے کے مستحق نہیں ہو، اگر تمھاری تنظیم میں

بڑی تعداد میں ہول ٹائم ورکر پیدا ہو جائیں، اور وہ ایسا کام انجام دیں جس کا اعتراف مسلمان عوام کسی دباؤ کے بغیر خود کریں، اور دل سے سمجھیں کہ ان کے لئے واقعی کوئی مفید کام انجام پا رہا ہے، تو پھر تم مبارکباد کے مستحق ہو سکتے ہو، ڈاکٹر صاحب نے گاندھی جی کی بات تسلیم کر لی، اس واقعہ کا ذکر کر کے ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ گاندھی جی کی یہ بات تمام سیاسی رہنماؤں اور کارکنوں کے لئے ایک مستقل پیام ہے،

غالباً ۱۹۴۰ء میں جب گاندھی جی نے اپنا ایک مرن بھرت ختم کیا تو ڈاکٹروں نے ان کو مکمل آرام لینے کی ہدایت دی، ملنے والوں کا آنا جانا بند کر دیا گیا، مگر انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو اپنے پاس بلایا، صرف انہی سے باتیں کرتے، ملک کے مسائل کے ساتھ مسلمانوں کے معاملات سے متعلق بھی سوالات کرتے رہتے، ڈاکٹر صاحب نے اس تنہائی میں اُن کی رفاقت کرتے ہوئے مسلمانوں کے خیالات سے آگاہ کیا،

ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ وہ گاندھی جی کو مسلمانوں کے اصلی جذبات سے برابر واقف کراتے رہے، اسی لئے ۱۹۴۱ء میں کانگریس کی ورکنگ کمیٹی میں واردھا میں اس بات کی تحقیق کے لئے ایک وفد مقرر ہوا کہ اس کے اراکین یہ معلوم کریں کہ مسلمان کانگریس سے کیوں بدظن ہیں، ایک نشست میں گاندھی جی کے سامنے اس بدظنی پر گفتگو شروع ہوئی، تو آصف علی نے کہا کہ مسلمان نوکریاں نہ ملنے کی وجہ سے کانگریس سے شاکی ہیں، پنڈت جواہر لال نہرو کو یہ بات ناگوار گزری، انھوں نے آصف علی سے بگڑ کر کہا کہ تم مسلمانوں پر یہ تہمت رکھ کر ان کی توہین کر رہے ہو، یہ اصلی سبب نہیں ہو سکتا، ڈاکٹر صاحب نے مہاتما جی کو مخاطب کر کے کہا کہ "میں نے کانگریس سے مسلمانوں کی بدظنی کے اسباب پر جو کچھ غور کیا ہے ان کو بیان کرنے میں گھنٹوں لگیں گے، وہ تفصیل سے سننا پسند کریں گے، تو تنہائی میں پیش کی جائے گی،

اس موقع پر صرف اتنا عرض ہے کہ مسلمان اتنے کم ظرف نہیں کہ وہ نوکریاں حاصل کرنے ہی کو اپنا مقصدِ حیات قرار دیدیں، ان میں غیر شعوری طور پر یہ احساس ہے کہ وہ ہندوستان آئے تو چھ سات سو سال کے اندر اپنے دورِ حکومت میں عدلیہ اور انتظامیہ کو سنوارا، ملک کو جغرافیائی وحدت دی، اپنی مذہبی اور معاشرتی زبانوں یعنی عربی اور فارسی کو چھوڑ کر اپنی وطنیت کے جذبے سے مقامی زبان اختیار کی جس کا نام اردو ہے، پھر کھانے پینے، رہنے سہنے، تعلیم دینے دلانے علم و ادب کو بڑھانے، تعمیرات، مصوری، موسیقی اور فنونِ لطیفہ وغیرہ کا ایک ایسا معیار پیش کیا کہ ایک ملا جلا تمدن خود بخود پیدا ہو گیا، اس تمدن میں انھوں نے ہندوؤں کی کچھ چیزیں اپنائیں، تو خود ہندوؤں نے ان سے بہت سی چیزیں لیں، مگر جب سے آزادی کی تحریک چلی ہے، اس کا تجزیہ کرنا ہوگا کہ اس ملے جلے تمدن کو مسلمان چھوڑ رہے ہیں، یا ہندو، یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہندو اس کو چھوڑ رہے ہیں، اور اپنی پرانی تہذیب کو واپس لانے کی شعوری اور غیر شعوری کوشش میں لگے ہوئے ہیں، گاندھی جی! آپ نے خلافت اور ترکِ موالات کی تحریک کے زمانے میں ہندو اور مسلمان دونوں کو بہت قریب تر کر دیا تھا، مگر اس تحریک کے بعد ہندوؤں نے تو آپ کو اپنا گرو اور نہاتما تسلیم کر لیا، لیکن مسلمان آپ سے دور ہو گئے، اس دوری کے اسباب پر زیادہ غور نہیں کیا گیا، مسلمان جاہل اور نادان تو نہیں ہیں، اس دوری کی کوئی وجہ ضرور رہی ہوگی، گاندھی جی! میرے خیال میں آپ محض ایک سیاسی لیڈر نہیں ہیں، بلکہ ایک سماجی لیڈر بھی ہیں، آپ کی بے مثال کوششوں سے ہندوستان کی آیندہ معاشرت کا جو نقشہ بن رہا ہے، اس میں مسلمان اپنے لئے کوئی جگہ نہیں پاتا، اسی لئے وہ کانگریس سے دور ہو گیا ہے، اور ہوتا جا رہا ہے" ڈاکٹر صاحب کا بیان ہے کہ گاندھی جی نے ان باتوں کو بہت غور سے سنا، پھر اُن سے کہا کہ یہ ساری باتیں تفصیل سے لکھ ڈالو، چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے

اس پر ایک پمفلٹ لکھا جو بمبئی میں چھپا، افسوس ہے کہ راقم کو یہ پمفلٹ نہ مل سکا، یہ باتیں بلفظہٖ ارائین کی نجی مجلس میں انھوں نے بار بار دہرائیں پھر رسالہ دوام کے انٹرویو میں اس کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا ہے (جون، جولائی ۱۹۷۰ء ص ۱۰) لکھنؤ کے ہفتہ وار اخبار عزائم میں بھی اس کا حوالہ آیا ہے (۲۸ مئی ۱۹۷۱ء ص ۹) ان باتوں کا ذکر کر کے کہنے کہ مسلمانوں کے مسائل کو آزادی سے پہلے اور اس کے بعد بھی میں ہندو رہنماؤں کے سامنے جرأت اور بے باکی سے پیش کرتا رہا ہوں لیکن مسلمانوں کو جھنجھوڑنے اور اُن کو غیرت دلانے کی خاطر ان کو ڈانٹنا بھی اپنا فرض اولین سمجھتا رہا۔

ایک موقع پر بیان کیا کہ احمد نگر کے جیل سے رہا ہوئے تو انھوں نے لارڈ ویول کو خط لکھا تھا جس پر بڑی نکتہ چینیاں ہوئیں، لیکن گاندھی جی نے انکی پوری حمایت اور مدافعت کی جس کے لئے وہ ان کے بہت ممنون رہے، وہ گاندھی جی کے ساتھ واردھا کے آشرم میں تقریباً ایک مہینہ تک رہے، اس زمانہ میں ڈاکٹروں نے اُن کو کھانے میں چوزہ کھانے کو بتایا تھا، آشرم میں گوشت نہیں پکایا جاتا تھا، لیکن گاندھی جی نے خاص طور پر اُن کے لئے چوزے پکوانے کا اہتمام کیا، وہ کموڈ استعمال کرنے کے عادی رہے، گاندھی جی نے ان کے لئے اس کا بھی انتظام کیا، رات کو سوتے وقت اُن کو پاؤں دبوانے کی عادت تھی، اس کے بغیر اُن کو نیند نہیں آتی تھی، گاندھی جی کو یہ معلوم ہوا تو انھوں نے ایک نوجوان کو ان کے پاؤں دابنے کے لئے مقرر کیا، دو تین روز کے بعد ان کو یہ معلوم ہوا کہ یہ نوجوان گریجوایٹ ہے، انھوں نے اس کا ذکر اپنے بڑے صاحبزادے سے کیا، تو وہ شرمندہ ہو کر گھر پر ان کے پاؤں دابنے لگے۔

ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی بیان کیا کہ آشرم کے قیام کے زمانے میں اس سے کچھ فاصلہ پر ایک جلسہ تھا، گاندھی جی آشرم سے کہیں گئے ہوئے تھے، اور وہیں سے جلسے میں جانے والے تھے، ان دنوں ان کی طبیعت کچھ ناساز تھی، ڈاکٹر صاحب آشرم کے ایک ساتھی کے ساتھ

جلسہ کے لئے پیدل چل کھڑے ہوئے، گرمی کا زمانہ تھا چلچلاتی دھوپ میں وہ سڑک پر جا رہے تھے، کہ یکایک گاندھی جی کی موٹر پیچھے سے آئی، انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو دیکھا تو موٹر رکوا لی، پھر اس سے اتر کر ان کے پاس آئے، اور بولے کہ کیسی بھول ہو گئی، آپ کو لینے کے لئے نہیں گیا، اب اس کی سزا اپنے کو دینا ضروری ہے، اس لئے اب آپ کے ساتھ جلسہ تک پیدل چلوں گا،" اُن کی طبیعت اچھی نہ تھی، اس لئے ڈاکٹر صاحب نے اصرار کیا کہ ہم دونوں موٹر ہی پر چلیں لیکن گاندھی جی اس لئے راضی نہیں ہوئے، کہ ان کو اپنے کو سزا دینا تھا، اسی طرح وہ جلسہ تک دھوپ میں چلتے رہے، جلسہ کے بعد ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ اب میں اچھا ہوں اسلئے کہ اپنے کو سزا دے لی،

ڈاکٹر صاحب نے ایک روز ایک عجیب بات کا انکشاف کیا، جس کو بعد میں انھوں نے رسالہ دوام کے انٹرویو میں بھی قلمبند کرایا، جب وہ وارودھا میں تھے، تو گاندھی جی نے ان سے کہا کہ یہ معلوم کرو کہ مسلمان کیا چاہتے ہیں، اس وقت پاکستان کی تحریک کا بڑا زور تھا، گاندھی جی نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ محمد علی جناح سے جب بھی میری بات چیت ہوتی ہے تو وہ خود کوئی بات نہیں کہتے، البتہ ایک تجویز پیش کر دیتے ہیں، اس زمانہ میں مرکز میں حکومت بننے کا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا تھا کانگریس اور مسلم لیگ میں کوئی سمجھوتہ نہیں ہو رہا تھا، ڈاکٹر صاحب اس نتیجے پر پہونچے کہ مسلم لیگ کی اس مانگ پر کہ مرکز میں مسلمانوں کو پچاس فی صدی نمایندگی دی جائے، غور کیا جا سکتا ہے تاکہ انگریزوں کی حکومت سے کسی نہ کسی دوام پر چھٹکارا ہو جائے، بعد میں سمجھوتہ کر لیا جائے گا، پنڈت جواہر لال نہرو تک یہ بات پہنچی، تو انھوں نے اس کی مخالفت کی، ڈاکٹر صاحب نے گاندھی جی کو یہ سمجھایا کہ اس طرح جمہوریت تو قائم نہ ہوگی، مگر انگریزوں کی غلامی سے نجات پانے کے خیال

سے اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے، گاندھی جی سوچ میں پڑ گئے، پھر بعد میں کہا کہ وہ اس پر راضی ہیں، ڈاکٹر صاحب سے کہا اس تجویز کو محمد علی جناح کے پاس لے کر جاؤ، ڈاکٹر صاحب نے محمد علی جناح کے پاس تو جانے سے معذرت کی، البتہ وہ بمبئی گئے، بھولا بھائی ڈیسائی سے ملے، گاندھی جی کا پیام پہنچایا، اور ان سے کہا کہ اس پر نواب زادہ لیاقت علی خاں سے گفت گو کی جائے، انہی دنوں پٹنہ کے سید عبدالعزیز بیرسٹر بمبئی علاج کے لئے آئے ہوئے تھے، وہ مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر بھی تھے، اور جناح صاحب کو ان پر بڑا اعتماد حاصل ہو گیا تھا، ڈاکٹر صاحب اُن سے بھی ملے لیکن ڈاکٹر صاحب کا بیان ہے کہ حالات کا رُخ ایسا بدلا کہ گاندھی جی کی مصالحانہ کوششیں ناکام ہو کر رہ گئیں،

پہلے ذکر آیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی وزارت کے زمانہ میں بہار میں زبردست بلوے ہوئے، گاندھی جی اس وقت نواکھالی میں تھے، ڈاکٹر صاحب کے خط لکھنے پر وہ بہار آئے، اُن ہی کے ساتھ ٹھہرے، اسی زمانہ میں کانگریس نے پنجاب اور بنگال کی تقسیم کی تجویز گاندھی جی کے مشورے کے بغیر منظور کر لی تھی، کانگریسی رہنماؤں کا خیال تھا کہ محمد علی جناح اپنی سیاسی ضد کی بنا پر اس تقسیم کے لئے راضی نہ ہوں گے، گاندھی جی نواکھالی سے بہار آئے، اور بہار سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی دعوت پر اُن سے ملنے دہلی چلے گئے، پٹنہ سے رخصت ہونے لگے، تو گاندھی جی نے ڈاکٹر صاحب سے اسٹیشن پر ریل کے ڈبے میں کہا کہ دہلی میں تمھارے دوستوں نے تقسیم طے کر لی ہے، تم کیا کرو گے، ڈاکٹر صاحب نے کہا میں تو تقسیم کے سراسر خلاف ہوں گاندھی جی نے بہت افسردگی سے کہا کہ میں بھی اس کے خلاف ہوں، مگر میں ایک ہاری جنگ لڑنے جا رہا ہوں، پھر بھی اچھی ٹکر لوں گا گو جانتا ہوں کہ ہار جاؤں گا، گاندھی جی کے انگریزی جملے ڈاکٹر صاحب کے بیان کے

مطابق یہ تھے :-

I am going to fight a losing battle, but I shall give them a big fight. I know I shall lose'

گاندھی جی نے کہا کہ مسلمانوں کو پاکستان دو ٹکڑوں میں ملے گا، وہ شاید مان جائیں، مگر اس تقسیم سے ہندو مسلمان دونوں تباہ ہو جائیں گے، گاڑی جب چلنے لگی تو گاندھی جی نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ میں دہلی سے لوٹ کر آؤں گا تو تمھارے گھر میں پلان بناؤں گا، کہ اس تقسیم کا مقابلہ کس طرح کیا جائے، گاندھی جی دہلی گئے، ڈاکٹر صاحب کا بیان ہے کہ انھوں نے چار پانچ دن تک ڈٹ کر مقابلہ کیا، مگر اُن کے ساتھیوں نے اُن کی بات نہ مانی تو وہ خاموش ہو گئے،

چند دنوں کے بعد خود ڈاکٹر صاحب دہلی گئے، گاندھی جی ہریجن کالونی میں تھے، ان سے جا کر ملاقات کی، تو ان سے پوچھا "تقسیم کے معاملہ میں آپ کیوں خاموش ہو گئے" جواب دیا کہ مجھے الٹی میٹم دیا گیا ہے، کہ تم خود گورنمنٹ چلاؤ، تو میں یہ کیسے کر سکتا ہوں میں نئی لیڈر شپ پیدا کر سکتا ہوں مگر اب اس کا وقت نہیں رہا،

ڈاکٹر صاحب کا بیان ہے کہ تقسیم جب عمل میں آچکی تو گاندھی جی نے ایک روز ان سے کہا کہ اب جب کہ ملک کی سالمیت باقی نہیں رہی، تو خود ہندو تباہ ہو جائیں گے، اور ملک برباد ہو جائے گا، ڈاکٹر صاحب گاندھی جی کی اس بات کو بار بار دہراتے رہتے، جوائنٹ ڈیفنس پر انھوں نے اسٹیٹسمین میں جو مضمون لکھا، اس میں گاندھی جی کے اس خیال کا اظہار کیا تھا، پھر ۱۹۶۱ء کے کنونشن میں بھی گاندھی جی کی اس رائے کا حوالہ دیا تھا پھر

رسالہ دوام کو جو انٹرویو دیا، اس میں گاندھی جی کے اس خیال کی وضاحت اس طرح کی ہے :-

"گاندھی جی کے مرنے کے بعد بات سمجھ میں آئی کہ ہندوؤں کی تباہی سے ان کا مفہوم کیا تھا، یہ حقیقت ہے کہ نفرت جب دو آدمیوں کے درمیان ہوتی ہے تو پھیل جاتی ہے، اس قاعدۂ کلیہ کی روشنی میں یہ اندیشہ بعید از قیاس نہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت خود ہندوؤں کے متعدد فرقوں کے درمیان نفرت کی موجب بن سکتی ہے، کارل مارکس نے دو غلطیاں کی تھیں، ایک تو نفرت کے جذبہ کے تحت طبقاتی جنگ شروع کرادی، دوسرے عیسائیوں کے مذہبی جھگڑوں سے یہ نتیجہ نکالا کہ مذہب دنیا کے لئے زہر ہے، مذہب سے اس نے روایت مرادلی، اس طرح اشتراکیت میں انسان دوستی کا پہلو باقی نہیں رہا، گاندھی جی کو اندیشہ تھا کہ مسلمانوں سے ہندوؤں کی نفرت خود ہندو قوم کی تباہی کا ذریعہ بن جائے گی۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ایسی نفرت کا پھیل ہر طرف موجود ہے، ذرا ذرا سی بات پر لوگ لڑتے ہیں، اور ہر ذات اپنی جگہ پر قوم بن گئی ہے،" (رسالہ دوام مئی ۱۹۷۱ء ص ۶۷)

ڈاکٹر صاحب کہتے کہ گاندھی جی اپنی زندگی کے آخری لمحات تک ہندو مسلم اتحاد کے خواہاں رہے، ان کے اس اتحاد کے جذبے کی بنا پر ہندوؤں کا ایک ناعاقبت اندیش گروہ ان کا دشمن ہوگیا، اور اسی کے ایک فرد نے اُن کو گولی ماردی، ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ وہ دسمبر ۱۹۴۷ء میں گاندھی جی سے ملے، ملک تقسیم ہوچکا تھا، دونوں طرف خونریز بلوے ہورہے تھے، اس وقت بھی گاندھی جی نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ لوگ یہ خیال کرتے ہیں،

کہ چونکہ میں ایک اچھا آدمی ہوں اور میل ملاپ اچھی چیز ہے اسی لئے میں میل ملاپ کا پرچار کرتا رہتا ہوں، ڈاکٹر صاحب نے ان سے سوال کیا کہ ہو تو کیا ہوگا گاندھی جی نے جواب دیا کہ "میں ہندو مسلمانوں کے میل ملاپ ہی میں ہندوستان کی اصلی فلاح اور نجات سمجھتا ہوں" ہندوستان کی تقسیم ہو چکی تھی، اس لیے ڈاکٹر صاحب نے کہا "اب بھی" گاندھی جی نے جواب دیا ہاں اب بھی، اگر یہ میل ملاپ ہو جائے تو ہم کو اپنی اصل منزل تک پہنچنے میں کوئی نہیں روک سکتا ہے، (نیز دیکھو رسالہ ہندو مسلم کلچرل کنکورڈ از ڈاکٹر سید محمود صفحہ ۸۵)

ڈاکٹر صاحب کی نجی مجلسوں میں پنڈت جواہر لال نہرو کا ذکر بارہا آیا، وہ تو اُن کے خاندان کا ایک جزو بن گئے تھے، ان کا خیال تھا کہ پنڈت جواہر لال نہرو جیسا نڈر، بے دھڑک، بے باک، دلیر، بہادر، محنتی، جفاکش، قابل، مقبول اور ہر دلعزیز لیڈر شاید ہی کسی ملک کو ملا ہوگا، جنگی فتوحات کی تو نہیں، مگر بسمارک، شارلیمین، اور اکبر کی ساری ہی خوبیاں ایک جگہ جمع ہو کر پنڈت جواہر لال نہرو میں منتقل ہو گئی تھیں، دونوں کیمبرج میں ساتھ رہے، اس لیے دونوں میں بڑی بے تکلفی رہی، ڈاکٹر صاحب اپنے سیاسی سفر میں ادھر اُدھر جاتے رہتے، تو اپنے ساتھ ایک ملازم بھی رکھتے، پنڈت جی نے ان سے ایک بار کہا کہ اس ملازم کی آخر کیا ضرورت ہوتی ہے، ڈاکٹر صاحب نے اُن سے کہا کہ مجھ سے راستہ میں اپنا بستر کھولا اور باندھا نہیں جاتا ہے، پنڈت جی نے کہا یہ کام میں انجام دے دیا کروں گا، چنانچہ اُن کے کہنے سے ڈاکٹر صاحب نے ملازم سفر میں رکھنا چھوڑ دیا، پنڈت جی اُن کا بستر کھول اور باندھ دیا کرتے تھے، سفر میں ڈاکٹر صاحب صبح کے وقت توس اور انڈے فرمایش کر کے منگایا کرتے تھے، اور اس کے علاوہ کچھ اور چائے کے ساتھ کھانا

پسند نہ کرتے تھے، ڈاکٹر صاحب کا بیان ہے کہ پنڈت جی نے اُن کی یہ عادت بھی یہ کہکر چھڑادی کہ صرف توس اور انڈے کا محتاج رہ کر ہوٹل کے بیروں کا انتظار کیوں کیا جائے، وہ دہی بڑے شوق سے کھاتے، اس لئے پلیٹ فارم پر اُتر کر خوانچے والوں سے خود خریدتے، اور اس کے لئے ڈاکٹر صاحب کو بھی مجبور کیا، دونوں میں بڑی بے تکلفی تھی، اس لئے کبھی نوک جھونک بھی ہو جاتی، اور عرصہ تک بول چال بند رہتی، پھر دونوں گلے مل جاتے، اور سارے شکوے جاتے رہتے، ڈاکٹر صاحب جب اُن کے اور دوسرے لیڈروں کے ساتھ نینی جیل میں تھے، تو وہ بیمار پڑ گئے، اُن کے کمرے میں آصف علی تھے، پنڈت جی نے آصف علی کو اپنے کمرہ میں کر دیا، اور خود ان کے کمرہ میں آکر اُن کی ہر طرح کی تیمارداری کرنے لگے، حتی کہ اُن کے جھوٹے برتن بھی اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر علٰحدہ کر دیتے، احمد نگر جیل میں بھی وہ علیل ہو گئے تھے، تو مولانا ابوالکلام نے انڈیا ونس فریڈم میں لکھا ہے کہ پنڈت جواہر لال ہی اُن کے نرس بنے رہے، (ص ۹۶) ڈاکٹر صاحب کہتے کہ پنڈت جی میں خدمت کرنے کا بے پناہ جذبہ تھا، اگر گاندھی جی نے پنڈت جواہر لال نہرو کو بنایا، تو پنڈت جواہر لال نے بھی گاندھی جی کو گاندھی جی بنا دیا، وہ روح تھے تو یہ جسم تھے، وہ جو بھی تجویزیں منظور کراتے، اس کو جواہر لال نہرو ہی عمل میں لاتے، جواہر لال نہرو کا بدن لوہے کا بنا ہوا تھا، وہ اپنی محنت سے رات کو دن کر دکھاتے، اگر آزادی کی تحریک میں گاندھی جی کی وجہ سے مہاتمائیت پیدا ہوئی تو پنڈت جی کی وجہ سے اُن کی دل آویز اور رعنا شخصیت کی بنا پر اس میں رعنائی اور دل آویزی پیدا ہوئی، اُن کی ذات پر اُن کے ساتھیوں کو جو اعتماد حاصل رہا وہ کسی ملک میں کسی رہنما کو حاصل نہیں رہا ہوگا،

ڈاکٹر صاحب نے ایک روز کہا کہ پنڈت جی کی ان ساری خوبیوں کی وجہ سے ان کے بعض حواریین اور ساتھی ان کو غلط طریقہ سے استعمال کرنے کی کوشش کرتے، اسی لئے لارڈ ماونٹ بیٹن نے ان کے متعلق ایک موقع پہ یہ خیال ظاہر کیا تھا، کہ اگر کچھ عرصہ تک ہندوستانی حضرات ان کی اسی طرح خوشامد کرتے رہیں گے، جس طرح کہ میں نے دیکھا ہے تو ان جیسے اونچے اخلاق و کیریکٹر کا آدمی بھی خراب ہو سکتا ہے، مگر ڈاکٹر صاحب کا بیان ہے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی اس رائے کو معلوم کرنے کے بعد پنڈت جی محتاط رہے، اور اپنے حواریوں کو بے جا فائدے اٹھانے کا موقع نہیں دیا، گو دوستوں کے سلسلہ میں ان کا دل نرم رہا، اور بعض دوستوں نے اُن سے فوائد بھی اٹھائے،

ڈاکٹر صاحب بھی کہتے کہ پنڈت جی نے انصاف پسندی کو اپنا شیوہ اور اصول بنا رکھا تھا، اسی سلسلہ میں بیان کیا کہ بہار کا ایک طالب علم بہت ہی ذہین تھا، وہ (یعنی ڈاکٹر صاحب) اس کی طرف بہت مائل تھے، وہ حکومت ہند کے اسٹیٹ بنک کے ایک مقابلہ کے امتحان میں بیٹھا، تو انتخاب میں آگیا، سی۔ آئی۔ ڈی کو اُس کے متعلق معلومات حاصل کرنے کو کہا گیا، تو اس کی طرف سے یہ رپورٹ آئی کہ وہ بڑا پاکستانی ہے، کیونکہ میلاد النبی کی تقریبوں میں برابر حصہ لیتا رہتا ہے، اس رپورٹ کے بعد اس کا تقرر روک دیا گیا، ڈاکٹر صاحب کو یہ معلوم ہوا تو وہ اس بے انصافی کو دور کرانے کے لئے پنڈت جی کے پاس پہنچ گئے، ان سے یہ واقعہ بیان کر کے کہا کہ ہم لوگ آزادی کی جنگ میں برطانوی حکومت کے سی۔ آئی۔ ڈی والوں پر ہنسا کرتے تھے، کہ وہ حکومت کو بے سروپا باتیں پہنچاتے ہیں، لیکن ہماری حکومت میں بھی سی۔ آئی۔ ڈی۔ اسی روایت کو قائم رکھے ہوئے ہے، پنڈت جی کو یہ واقعہ سن کر افسوس ہوا، اور متعلقہ محکمہ سے بازپرس کرائی، اور اس طالبعلم

کو جگہ دلائی،

ڈاکٹر صاحب نے اپنی تحریروں اور گفتگوؤں میں اس کا حوالہ کئی بار دیا، کہ پنڈت جواہر لال نہرو اُن سے برابر کہا کرتے کہ تم میں ضرورت سے زیادہ نرمی ہے، جارحیت نہیں ہے، سب کچھ اپنے اوپر اوڑھ لیتے ہو، سیاست میں جارحانہ پہلو بھی اختیار کرنا پڑتا ہے، ورنہ کامیابی حاصل نہیں ہوتی، ڈاکٹر صاحب اعتراف کرتے کہ اُن کے متعلق پنڈت جی کی رائے بالکل صحیح تھی، اسی لئے وہ برابر کہتے کہ وہ ایک کامیاب سیاست دان یا لیڈر نہیں ہوسکے اسی کے ساتھ کہتے کہ انھوں نے اپنے کو کبھی سیاست داں یا لیڈر نہیں سمجھا، بلکہ اپنے کو محض ایک قومی کارکن سمجھتے رہے، اپنی وفات سے چند مہینے پہلے عزائم میں "رودادِ چمن" کے عنوان سے جو مضمون لکھا اس میں تحریر کرتے ہیں، :-

"میں نہایت ادنی ..... کارکن رہا ہوں، اور اب بھی ہوں، اپنے کو ایک ادنیٰ ترین انسان سمجھتا ہوں، اپنے سیاسی مشاغل کے باوجود یہی دعا کرتا رہا،

مجھے ہر طرح کی خود بینیوں سے کردے بیگانہ
جو آئینہ بھی میں دیکھوں نمایاں میری صورت ہو

اور حضرت آسی۔ کے اس شعر کا قائل ہوں،

ہمارے دید میں فہمید میں دے ایسی یکرنگی
کہ صورت عین معانی اور معانی عین صورت ہو

میری زبان پر یہ شعر رہتا ہے،

کہیں اکسیر سے بڑھ کر ہے دولت خاکساری کی
جہادِ نفس کا شاید یہی مالِ غنیمت ہو

ان سطروں میں کیسی خاکساری اور عاجزی ہے، انھوں نے کئی بار اپنے اس خیال کا بھی اظہار کیا کہ اُن کی اصلی خواہش تھی کہ وہ اپنے استاد مسٹر بلنٹ اور مسٹر ایڈورڈ براؤن کی طرح یونیورسٹی میں ایک کامیاب پروفیسر ہوں، مگر وطن کی محبت میں وہ آزادی کی جنگ میں بے اختیار کود پڑے، اسی کیساتھ اپنی سیاسی زندگی کو پلٹ کر دیکھتے تو کہتے کہ میری آرزو تھی کہ اپنے وطن کے ہندو مسلمان دونوں ہموطنوں کیلئے ایک بڑی رنگین بزم اور حسین مجلس تیار ہو، اس کے سجانے کے لئے گاندھی جی، پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے ساتھی مل گئے تھے، پھر بھی میری آرزو پوری نہیں ہوئی، اُن کے بعد اب سوچا کرتا ہوں کہ کہاں سے وہ ساتھی لاؤں جو میرے خوابوں میں رنگ بھر سکیں، میرا بس چلتا تو میں ہندو مسلمان دونوں کو سگے بھائیوں کی طرح ملا دیتا، اور اگر اتنی بصیرت حاصل ہوتی، تو ایسا لائحۂ عمل بھی تیار کرتا، جس میں اسلام کی اصلی روح کارفرما ہوتی، مسلمانوں کی حیاتِ نو کے لئے ایک ایسا پروگرام بھی ترتیب دیتا جو نئے زمانے کی ترقی اور اسلام کی شوکت اور سطوت پر مبنی ہوتا،

وہ اس زمانہ کو یاد کرتے جب خلافت کی تحریک کے سلسلہ میں تمام مسلمان قائدین ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوگئے تھے، اُن کے نزدیک خلافت کی تحریک کی بڑی اہمیت تھی، اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں، کہ ہندوستان میں خلافت کی تحریک چلائی گئی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام آزاد، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، اور اُن کے ساتھیوں کی بدولت ہزاروں باہمت اور مخلص مسلمان پیدا ہوگئے، اُن کی بے مثال قربانیوں نے دنیائے اسلام کو متاثر کیا، اگر مصطفےٰ کمال نے خلافت کو ختم نہ کر دیا ہوتا تو ہندوستان خلیفۂ اسلام کا بہت بڑا دوست بنا رہتا، اور اسلامی ممالک بھی ہندوستان کے

دوست بنے رہتے،" (عزائم ۲۰ ؍ مئی ۱۹۸۱ء ص ۱۴)

اُس زمانہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کی تقریروں میں جو شعلہ بیانیاں آتش فشانیاں اور ولولہ انگیزیاں ہوتیں ان کا ذکر کرکے بہت محظوظ ہوتے، ان کا نام بڑی عزت سے لیتے رہے، مولانا ابوالکلام آزاد بھی اُن کو عزیز رکھتے، بہار میں جب دوسری کانگریسی وزارت بن رہی تھی، تو ان کے لارڈ ویول کو خط لکھنے پر اُن کی ذات متنازعہ فیہ بنی ہوئی تھی، مولانا ابوالکلام آزاد اس زمانہ میں کانگریس کے صدر تھے انھوں نے بیچ بچاؤ کرا اپنے اختیارِ خصوصی سے اُن کو وزارت میں شامل کرایا، ڈاکٹر صاحب کا بیان ہے کہ مولانا اپنے رکھ رکھاؤ اور وقار کی وجہ سے ہر جگہ نمایاں رہے، کانگریس کی کسی نشست میں اکثر شریک ہوتے تو اُن کے ہندو ساتھیوں کو ایسا معلوم ہوتا کہ اسلام اپنے وقار کے ساتھ ان کے پاس آگیا ہے، وہ اُن کی تفسیر ترجمان القرآن کے بڑے قائل تھے، اس کی خوبیوں کو بتاتے ہوئے ایک موقع پر کہا کہ یہودیوں کا سخت اعتراض تھا، کہ کلام پاک میں ذوالقرنین کا قصہ محض فرضی اور خیالی ہے، امام رازی نے اس الزام سے بچنے کے لئے ذوالقرنین کو سکندر اعظم قرار دے دیا ہے، سکندر اعظم بہت بڑا فاتح ضرور تھا لیکن اخلاقی حیثیت سے ادنیٰ درجہ کا انسان تھا، اس کا ذکر کلام پاک میں نہیں آسکتا تھا، خوشی کی بات ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی تحقیق سے ثابت کر دیا ہے کہ ذوالقرنین ایران کا بادشاہ تھا، وہ ایسی ٹوپی پہنتا تھا جس کے دونوں طرف کوئی چیز سینگ کی طرح نکلی رہتی تھی، وہ اپنے اوصاف میں انبیاء کے مشابہ تھا،

پہلے ذکر آیا ہے کہ جب حیدرآباد کے ڈاکٹر عبداللطیف نے ترجمان القرآن کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو ڈاکٹر صاحب نے اس کے لئے سرمایہ فراہم کرنے کی کوشش کی

تاکہ یہ تفسیر انگریزی دانوں کے ہاتھوں میں بھی پہونچ جائے،

ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی بیان کیا کہ مولانا اپنے وقار اور رکھ رکھاؤ کی وجہ سے کسی سے بہت کم بے تکلف ہوتے، اُن کی سب سے بڑی بے تکلفی یہ ہوتی جب وہ کسی سے "ارے بھائی" کہکر گفتگو کرتے اور کوئی اُن سے بے تکلف ہوجانے کی کوشش کرتا، تو اس بے تکلفی کی ایک حد اُن کے یہاں مقرر تھی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو اپنی بے تکلفی میں اس حد کو پار کر گئے تھے، انھوں نے بھی مولانا کو "ارے بھائی" سے مخاطب کرنا شروع کیا، جو مولانا کو ناگوار گذرا، اسی لئے وہ کانگریس کی اپنی صدارت کے زمانے میں ان سے کچھ ایسے بے نیاز رہے کہ وہ نمایاں نہ رہ سکے،

مسز اندرا گاندھی سے تو اُن کو بڑی محبت رہی، وہ اپنی بیٹی ہی کے برابر سمجھتے رہے، مسز اندرا گاندھی بھی ان کا بڑا لحاظ کرتیں، ڈاکٹر صاحب اُن کو اندو کے نام سے یاد کرتے، اور جب اُن کو خط لکھتے تو مائی ڈیر اندو جی کر کے مخاطب کرتے، دارالمصنفین میں ایک بار کسی نے ان سے کہا کہ مسز وجے لکشمی پنڈت اگر وزیر اعظم ہوتیں تو شاید زیادہ کامیاب رہتیں، ڈاکٹر صاحب نے اس کا جواب دیا کہ میں دونوں کو اچھی طرح جانتا ہوں، وزیر اعظم ہونے کی جو صلاحیت اندو میں ہے، وہ مسز پنڈت میں نہیں، ان میں باپ ہی کے سارے اوصاف ہیں،

ڈاکٹر صاحب سیاسیات سے علٰحدہ ہو کر اپنے نجی کاموں میں لگے ہوئے تھے کہ ۱۹۶۹ء میں لکھنؤ میں شیعہ سنی کا زبردست فساد ہوا، دونوں طرف جانیں ضائع ہوئیں، اس کی تفصیلات پڑھ کر ڈاکٹر صاحب بے چین ہو گئے، اس زمانہ میں کئی بار دارالمصنفین آئے، بار بار تاسف کا اظہار کیا، اور دونوں فرقوں میں باہمی سمجھوتہ کی بہت سی صورتیں پیش کیں، آخر میں یہ طے کیا کہ پہلے شیعوں کے بجائے سنی مسلمانوں کو مخاطب کر کے ان جھگڑوں کے تاریک

پہلوؤں سے آگاہ کیا جائے، انھوں نے مجھکو سُنی مسلمانوں سے ایک دردمندانہ اپیل لکھنے کو کہا، میں نے ایک مسودہ تیار کیا، لیکن انھوں نے خود اس میں اضافے بھی کئے، اس کے سرورق پر قرآن کی کچھ آیتیں ہیں، جن کے معنی یہ ہیں، :-

"اگر مسلمانوں کے دو فرقے آپس میں لڑیں، تو ان میں صلح کرا دو، اور پھر اگر ان میں کا ایک فرقہ دوسرے پر زیادتی کرے، تو جو زیادتی کرتا ہے، اس سے لڑو، یہاں تک کہ وہ حکم خدا کی طرف رجوع لائے، پھر جب رجوع لے آئے تو فریقین میں برابری کے ساتھ صلح کرا دو، اور انصاف کو ملحوظ رکھو، بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے، مسلمان تو بس آپس میں بھائی بھائی ہیں، تو اپنے دو بھائیوں میں میل جول کرا دیا کرو، اور خدا کے غضب سے ڈرتے رہو، تاکہ خدا کی طرف سے تم پر رحم کیا جائے"،

یہ کلام پاک کی آیتیں اور اُن کے معانی ڈاکٹر صاحب کے لکھائے ہوئے ہیں، پھر اس میں امام شافعی کے دو عربی اشعار بھی ہیں، جن کے معنی یہ ہیں، کہ "اہلِ بیت کی عظمت کے لئے یہ کافی ہے کہ جو اُن پر درود نہ بھیجے اُس کی نماز نہیں ہوتی، اگر آلِ محمدؐ سے محبت کرنے کا نام شیعیت ہے، تو جن و انس دونوں گواہ رہو کہ میں شیعی ہوں" یہ دو اشعار ان ہی کے کہنے پر بڑھائے گئے، پھر آخر میں ایک خواب کا ذکر ہے جو ان ہی کا ہے، جیسا کہ اس مقالہ کی ابتدا میں بیان کیا جا چکا ہے،

ڈاکٹر صاحب نے اس اپیل پر بہار اور یو۔پی کے لوگوں کے دستخط خود اُن کے پاس جا جا کر کرائے، اُس کی اشاعت میں بڑی محنت کی، اور جب یہ اپیل شائع ہوئی، تو ایسا معلوم ہوا کہ وقت کی پکار تھی، اس کو ہندوستان کے تمام اخبارات نے شائع کیا، شیعوں

پر سنیوں سے زیادہ اثر پڑا، لکھنؤ، علی گڑھ، فیض آباد، جونپور، اور بمبئی کے مجتہدوں نے بھی اپنی طرف سے بڑی دردمندانہ اپیل شائع کی، ڈاکٹر صاحب کے پاس سیکڑوں خطوط اور تار پہنچے کہ شیعوں اور سنیوں کے اتحاد کے لئے ایک کانفرنس بلائی جائے، جس کی صدارت ان ہی کو پیش کی گئی، وہ ایک بڑے پیمانہ پر ایک کانفرنس منعقد کرنے کی فکر میں لگ گئے، اس کے لئے شاہ ایران کو بھی ایک خط لکھا، جنھوں نے اپنے یہاں تبرا کو ختم کر کے شیعہ سنی کو شیر و شکر کر دیا ہے، اس کانفرنس کا پروگرام ڈاکٹر صاحب بنا ہی رہے تھے کہ ہندوستان کے پارلیمنٹ کے عبوری انتخاب کا اعلان ہو گیا، اس کے ہنگاموں میں کانفرنس کا انعقاد مناسب نہ سمجھا گیا، ۱۹۷۱ء میں یہ کانفرنس ہو سکتی تھی، مگر ڈاکٹر صاحب بیمار پڑ گئے، اور اللہ کو پیارے ہو گئے، اور کانفرنس کی آرزو بھی اُن کے ساتھ سپرد خاک ہو گئی، اپنی وفات سے تین مہینے پہلے بمبئی کے ہفتہ وار اخبار کاروانِ حیات کو ایک لمبا انٹرویو دیا جس کی جستہ جستہ باتیں یہ ہیں، کہ مسلمانوں میں اتحاد کی ضرورت کا احساس مجھے ہمیشہ سے رہا لیکن اب خاص طور سے اس کی اہمیت زیادہ ہے، سُنی شیعے کے جھگڑے نہ صرف مسلمانوں بلکہ اسلام کی تذلیل و تضحیک کا باعث ہیں، یہ لڑائی جس طرح سڑکوں پر لڑی جاتی ہے وہ بہت شرمناک ہے، اس لئے سب کو مل کر اس خطرناک جنگ کو روکنا چاہئے، ضرورت اس بات کی ہے کہ اتحاد بین المسلمین کے لئے برابر مضامین شائع ہوتے رہیں، لوگوں نے انا مدینۃ العلم و علی بابہا کے مفہوم کو محدود کر دیا ہے، اور اس حدیث کے ترجمہ و تفسیر میں صرف کتابی علم پر زور دیا، اور روحانی تعلیم کو شامل نہیں کیا، جس طرح رسولِ اکرمؐ روحانی پیشوا تھے، اسی طرح حضرت علیؓ بھی تھے، حضرت علیؓ کی دنیاوی خلافت تو اس دور کے ساتھ ختم ہو گئی، لیکن روحانی خلافت آج تک

قائم ہے اور ہمیشہ رہے گی، یہی وجہ ہے کہ صوفیائے کرام خدا کی راہ میں حضرت علیؓ کا دامن تھامتے ہیں، سُنی اور شیعہ دونوں ایک دوسرے کو Tolerate کرنا سیکھیں، جس طرح علی گڑھ میں کیا جاتا ہے کہ نمازِ جمعہ اور نمازِ عیدین وغیرہ ایک ہی مسجد میں ادا کی جاتی ہے، ہم ایک دوسرے کے وجود کو تسلیم کریں، اور مل مل کر رہنے کی عادت ڈالیں، سرِدست اگر یہی ہو جائے تو بہت ہے،

۱۹۷۰ء کا آخری حصہ ہندوستان کے لئے بڑا پُر آشوب تھا، کانگریس کی حکومتیں صوبوں میں ڈانواڈول رہتیں، زیادہ تر صوبوں میں صدارتی راج ہو گیا تھا، کہیں مضبوط حکومت نہیں بن پاتی تھی، دوبارہ انتخاب سے بھی مسئلہ حل نہیں ہو رہا تھا، مرکزی حکومت مضبوط تھی، مگر صدارتی انتخاب کے سلسلہ میں کانگریس میں پھوٹ پڑ گئی، اور یہ دو حصوں میں تقسیم ہو گئی، ایک پرانی اور دوسری نئی کانگریس کہلانے لگی، پرانی کانگریس کے صدر نجلنگپا رہے، اور نئی کانگریس کے صدر جگ جیون رام ہوئے، نئی کانگریس کی روحِ رواں وزیرِ اعظم مسز اندرا گاندھی رہیں، لیکن پارلیمنٹ کے اندر بھی کانگریس کی دو پارلیمنٹری پارٹیاں ہو گئیں، مسز اندرا گاندھی کی وزارت ختم کرنے کے لئے پارلیمنٹ کی اور دوسری پارٹیاں بھی پرانی کانگرس کے ساتھ مل گئیں، مسز اندرا گاندھی نے ان سے دلیرانہ مقابلہ کیا، اور آخر میں پارلیمنٹ کو توڑ کر نئے سرے سے انتخاب لڑنے اور عوام کا فیصلہ معلوم کرنے کے لئے تیار ہو گئیں، انتخاب کی مہم شروع ہوئی، تو ہندوستان کی تمام پارٹیوں نے مسز اندرا گاندھی کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کیا، اور وہ انتہائی پریشانیوں میں مبتلا ہو گئیں،

اس موقع پر ڈاکٹر صاحب کا وطنی جذبہ پھر غیر معمولی طور پر ابھرا، اُن کو خیال ہوا کہ

اس وقت مسز اندرا گاندھی ہی ملک کی صحیح قیادت کر سکتی ہیں، وہ یا اُن کی نئی کانگریس ہار گئی، تو یہ ملک سرمایہ داروں، مفاد پرستوں، رجعت پسندوں اور فرقہ پروروں کے ہاتھوں میں چلا جائے گا، پھر یو. پی. بہار اور بنگال میں مختلف پارٹیوں کی ملی جلی حکومتوں کا تجربہ ناکام ہو چکا تھا، اگر متحدہ محاذ کی حکومت مرکز میں تشکیل ہوئی تو وہاں بھی تجربہ ناکام رہے گا، اور ملک تباہی کی طرف چلا جائے گا، ڈاکٹر صاحب اس نتیجہ پر پہونچے کہ مسز اندرا گاندھی کی قیادت ہی میں ملک سے سرمایہ داری ختم کی جا سکتی ہے ہندو مسلمانوں کے اختلافات مٹائے جا سکتے ہیں، ذات پات کے جھگڑوں سے معاشرت نجات پا سکتی ہے، سیکولرزم کو صحیح معنوں میں قائم کر کے ملک کو ایک مضبوط اور پُرامن شاہراہ پر لے جایا جا سکتا ہے، یہ سوچ کر وہ مسز اندرا گاندھی اور اُن کی نئی کانگریس کی حمایت میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے، دارالمصنفین ہی سے مسز اندرا گاندھی کو ایک خط میں لکھا کہ "وہ اپنی زندگی کے آغاز میں آزادی حاصل کرنے Win freedom کے لئے آگے بڑھے تھے، اب زندگی کے اس آخری ایام میں آزادی کو بچانے Save freedom کی خاطر آگے بڑھ رہے ہیں، گاندھی جی نے ۱۹۳۰ء میں کہا تھا کہ اگر ہم نے اس موقع کو کھو دیا تو پھر دو سو برس تک اس کا موقع نہیں آسکتا، اسی طرح اس الکشن کے موقع کو ہم نے کھو دیا تو دو سو برس تک پھر موقع نہیں آئے گا، دارالمصنفین آپ کے ساتھ ہے، وہ سب کچھ آپ کے لئے کرے گا" پھر مجھ کو ہدایت کی کہ انتخاب کے لئے پمفلٹ اور اشتہارات یہاں سے شائع کئے جائیں، کچھ خود لکھوائے اور کچھ مجھکو لکھنے کو کہا، اس طرح دارالمصنفین سے مختلف قسم کی اپیلیں ہزاروں کی تعداد میں چھاپ کر ملک کے مختلف حصوں میں بھیجی گئیں، اور یہ ادارہ کچھ دنوں کے لئے انتخاب کی مہم کا ایک دفتر بن گیا تھا، خود ڈاکٹر صاحب

ایک طوفانی دورے کے لئے نکلے، فیل پا کی وجہ سے چلنے سے مجبور تھے، آنکھوں کی بینائی بھی بہت کم رہ گئی تھی، سنائی بھی کم دیتا، مگر ایک جوان کی طرح یو۔ پی اور بہار کا دورہ ایک ڈیڑھ ہفتہ میں ختم کیا، دہلی اپنے گھر پہونچے تو بالکل خستہ اور نیم جان تھے، اُن کے بستر مرگ کے پاس اُن کے بڑے لڑکے محبوب احمد صاحب نے مجھ سے ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ کہا، انتخاب کے طوفانی دورہ میں اُن کی ساری انرجی ختم ہو گئی ہے، اگر یہ دورہ نہ کرتے تو ابھی تندرست رہ کر کچھ دنوں اور زندہ رہتے، جب انتخاب کا نتیجہ نکلا، تو وہ مسز اندرا گاندھی کی شاندار کامیابی سے بے حد خوش تھے، کہتے کہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں ہندوستان کو تباہی اور بربادی سے بچتے ہوئے دیکھ لیا، اب ایک مضبوط مرکزی حکومت کی وجہ سے ہندوستان ترقی کی شاہراہ پر گامزن رہے گا، پھر بڑی محبت کے ساتھ مسز اندرا گاندھی کے پاس جا کر ان کو مبارکباد دی،

انھوں نے اپنی آخری زندگی میں اپنی زندگی کا جو جائزہ لیا، اس کی جھلکیاں ایک تو اس طویل انٹرویو سے ظاہر ہوگا جو انھوں نے ۱۹۷۱ء کے آغاز میں رسالہ دوام ماہنامہ فیض آباد کو دیا، یہ اسی سال اس کی چار اشاعتوں میں چھپا، دوسرے اُن کے اس طویل مضمون سے ظاہر ہوگا جو انھوں نے مارچ اور اپریل ۱۹۷۱ء میں "رودادِ چمن" کے عنوان سے لکھا، اس میں مجلس مشاورت کی ناکامی کے اسباب پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، یہ لکھنؤ کے ہفتہ وار اخبار عزائم کے ۲۸ رمئی ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں شائع ہوا، یہ اُن کی زندگی کی سب سے آخری تحریر تھی، ان دونوں میں ان کے زندگی کے کوائف کے ساتھ اُن کے مذہبی اور سیاسی خیالات سے متعلق بعض بہت ہی مفید اور نصیحت آمیز باتیں بھی معلوم ہوتی ہیں، ان میں سے کچھ ہم ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں :-

"اسلام کی اصلی دعوت وعزیمت خدا کو صرف رب المسلمین پیش کرنے میں نہیں، بلکہ اس کی حقیقی دعوت وعزیمت خدا کو رب العالمین بنا کر پیش کرنے میں ہے، اسلام کی دعوت وعزیمت صرف مسلمانوں کے دلوں کو جوڑنے اور غیر مسلموں کے دلوں کو توڑنے میں نہیں ہے، اگر دعوت وعزیمت کے سلسلے میں غیر مسلموں کے دلوں کو جوڑنے کی کوشش کی جائے، تو اُن کے دلوں سے وہ نفرت اور حقارت جاتی رہے، جو ان میں مسلمانوں کے لئے پیدا ہو گئی ہے"

(عزائم ۲۰ر مئی ۱۹۷۱ء، ص ۱۴)

"جو مسلمان قائد صرف اسلام کا نمائندہ بن کر آگے بڑھے گا اور حالات حاضرہ پر نظر نہیں رکھے گا وہ کامیاب نہیں ہو سکے گا، اسی طرح جو رہنما صرف حالاتِ حاضرہ کو سامنے رکھے گا، اور اس کی گہری نظر اسلام پر نہ ہو گی، تو وہ بھی مسلمانوں کے لئے مفید نہ ہو سکے گا، (ایضاً)

میں اس اُمت (یعنی مسلمانوں) کی پوشیدہ صلاحیتوں سے ناواقف نہیں، رسول اللہؐ کی اس پیشین گوئی کو سچ سمجھتا ہوں کہ مجھے ہندوستان کی طرف سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں، مجھے یقین ہے کہ مادیت اور حیوانیت کے اس دور میں اسلام کی روشن کرن یہیں سے طلوع ہو گی، اور یہاں کے لوگوں کو اخلاق و انسانیت کا بھولا ہوا سبق یاد دلائے گی"

(رسالہ دوام جون، جولائی ۱۹۷۱ء)

اسلام نے تین زبردست چیزیں ہمارے ہاتھ میں دیدی ہیں، اجتہاد، قیاس، اجماع، اس نے اس مذہب کو نہایت سائنٹفک بنا دیا ہے،

مگر یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ اجتہاد کے معاملہ میں ہم نے سست روی سے کام لیا، بلکہ ایک عرصہ تک اس کا دروازہ بند رکھا" (رسالہ دوام ایضاً ص ۱۵)

"کسی جماعت یا لیڈرشپ کیلئے آسان نہیں ہو تا کہ پچھلی روایات کے سانچے میں ڈھل کر اس کا جو مزاج بن گیا ہے، اس سے دامن چھڑا کر نئے حالات اور تقاضوں کے مطابق قدم بڑھا سکے، اس کی پچھلی روایات بت بن کر سامنے آجاتی ہیں،"

(دوام جون، جولائی ۱۹۷۱ء ص ۶)

"بدقسمتی سے سیاست کا مفہوم مسلمانوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ الیکشن میں حصہ لیا جائے اقتصادی، تعلیمی اور سماجی حالت کی اصلاح کو لوگ سیاست نہیں سمجھتے، اس وقت جب کہ مسلمان ہر کن ہوتے چلے جا رہے ہیں، انھیں اقتصادی، تعلیمی اور سماجی حیثیت سے سنبھالنے کی ضرورت ہے،"

(دوام جون، جولائی ۱۹۷۱ء ص ۹ و عزائم ۲۸ مئی ۱۹۷۱ء ص ۱۱)

"تنظیم کرنا ایک اچھی چیز ہے مگر اس کے لئے لاتعداد بے غرض اور بغیر تنخواہ کارکنوں کی ضرورت ہوتی ہے، وہ ہم میں مفقود ہیں، جو لوگ ممبری اور منسٹری کی تلاش میں رہتے ہیں، یہ بیچارے کیا تنظیم کریں گے، عملی سیاست میں تنظیم میں سب سے بڑی چیز قربانی ہے، پہلے قائد خود قربانی کرتا ہے، پھر اپنے پیروؤں سے قربانی کا طلب گار ہوتا ہے تنظیم اوپر سے ٹھونسی نہیں جاتی ہے،"

(عزائم ۲۸ مئی ۱۹۷۱ء ص ۱۱)

"مسلمان نوجوان محنت کرنا نہیں جانتا، دوسری قوم کے نوجوان تو ذرا سے سہارے پر آگے نکل جاتے ہیں، انھیں چنا بیچ کر اور چھوٹی سی دوکان رکھکر

تجارت کرنے کا سلیقہ آجاتا ہے، اسی طرح کی اسپرٹ مسلمان نوجوانوں میں پیدا کرتی ہے۔" (دوام جون، جولائی ۱۹۷۱ء ص ۱۶)

روداد چمن میں کچھ باتیں ڈاکٹر صاحب کے قلم سے ایسی بھی نکل گئی ہیں، جو مولانا ابوالحسن علی کی شان، اور خود ڈاکٹر صاحب کی مرنجاں مرنج طبیعت کے خلاف ہیں، معلوم نہیں کن لمحات میں وہ یہ باتیں لکھ گئے، اپنی آخری علالت میں ان باتوں کے لکھنے پر متاسف ہوئے، اور مولانا ابوالحسن علی ندوی سے معذرت کہلا بھیجی، مولانا خود ڈاکٹر صاحب کے پاس عیادت کے لئے پہونچے، اور وہ بھی ان سے معذرت خواہ ہوئے، جس کے بعد یقین ہے کہ اُن کو چین سے ابدی نیند آئی ہوگی، کیونکہ وہ پوری زندگی دوسروں کے دل دکھانے یا اُن کو رنج پہنچانے سے گریز کرتے رہے، ان کی طبیعت میں خیر ہی خیر تھی، وہ نہ شر کو سوچ سکتے تھے، اور نہ اس پر عمل کرنا جانتے تھے،

اُن کی وفات پر ان کے عقیدت مندوں کی آنکھیں پُرنم ہوئیں، وہ خوش قسمت تھے، کہ عمر طویل پائی، گو وہ ابھی اور زندہ رہنا چاہتے تھے، مگر موت پر کس کا بس ہے، معلوم ہوا کہ مسز اندرا گاندھی کے سکریٹریٹ سے جامعہ ملیہ ٹیلیفون پہنچا کہ ان کی تدفین وہیں ہو لیکن ان کے عزیزوں اور عقیدتمندوں نے شاہ ولی اللہ کے قبرستان میں دفن کرنا پسند کیا، یہ بھی اچھی جگہ ملی، صدر جمہوریہ نے اُن کی وفات پر تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ پکے قوم پرست تھے، مسز اندرا گاندھی اس وقت روس میں تھیں، جب وہاں سے آئیں تو ڈاکٹر صاحب کی بیگم صاحبہ کے پاس - مہادیو روڈ میں جاکر دیر تک اظہار غم کرتی رہیں، اخباروں میں ان پر بہت سے تعزیتی مضامین شائع ہوئے، نظمیں بھی لکھی گئیں، وفات پر قطعہ تاریخ بھی لکھا گیا، ایک دو قطعات کے کچھ اشعار یہ ہیں،

ڈاکٹر محمود معمارِ وطن — مردِ غازی نازشِ ہندوستاں
گاندھی و آزاد و نہرو کا رفیق — جنگِ آزادی کے پرچم کا نشاں
مادرِ ملت کا فرزندِ سعید — صاحبِ کردار مردِ خوش بیاں
عالمِ فانی سے رخصت ہوگیا — چور ہے غم سے دلِ ہندوستاں
مصرعِ تاریخِ رحلت کن قمر — داخلِ جنت ہوا تابت نشاں
۱۳۹۱ھ

اُٹھے جاتے ہیں اک کر کے سارے ملک کے رہبر — ہوئے اس عالمِ فانی سے اُف محمود بھی رخصت
امام الہند کے دل تھے تو دستِ راست نہرو کے — انھیں حاصل تھی اس ملکی سیاست میں بڑی عزت
وہ سلجھاتے رہے تھے شانۂ فکر و تدبر سے — جہاں الجھا نظر آیا انھیں کچھ گیسوئے بھارت
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھی مرنیوالے میں — عطا کر دے خدا اس کے صلے میں گلشنِ جنت
سنہ ہجری میں کہدوائے قمر تاریخِ رحلت بھی — ہوئی بے وقت ہے ہے ڈاکٹر محمود کی رحلت
اسی مصرعہ سے کہدو عیسوی میں از سرِ ابجد — ہوئی بے وقت ہے ہے ڈاکٹر محمود کی رحلت

پہلا قطعہ تاریخ قمر چھپارودی اور دوسرا قمر ٹکاروی کا ہے، مدینہ اخبار بجنور نے اپنے ایک لمبے اداریے میں یہ بھی لکھا،

"ڈاکٹر سید محمود ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہو گئے، اس طرح ہماری قومی تاریخ کا ایک اور باب مکمل ہو گیا، ایک ایسا باب جو اپنی تابناکی اور درخشندگی کے اعتبار سے پہلے ختم ہونے والے ابواب سے زیادہ نہ ہو مگر اُن سے کم بھی نہیں ہے، ایک ایسا باب جس پر ہر ہندوستانی کو بلا لحاظ مذہب و ملت فخر ہو سکتا ہے، ایک ایسا باب جسے پڑھ کر ہمیں اپنی قومی زندگی میں جہدِ مسلسل، بے لوث قربانی، انتھک خدمت، ایثار نفسی، اصول کی پابندی"

کے سبق کا ایک ایسا نمونہ ملتا ہے، جو کسی قوم کے لئے باعثِ فخر اور قابلِ تقلید ہوسکتا ہے۔" (۱۳؍ اکتوبر ۱۹۷۱ء)

ڈاکٹر صاحب سفرِ آخرت پر جا چکے، میرے قلم کے مسافر کو بھی رُکنا چاہئے، مگر بے اختیار حسب ذیل سطریں قلم سے نکل رہی ہیں :-

ڈاکٹر صاحب! اب آپ ابدی نیند سو رہے ہیں، آپ نے اپنے عنفوانِ شباب میں ایک آزاد ہندوستان کا خواب دیکھا تھا، وہ سچ ثابت ہوا، آپ آزادی کی جنگ میں شریک ہوئے، تو اُس کے ہر مورچہ پر پامردی اور جانبازی دکھائی، اور ہندوستان کی آزادی کو دیکھ کر آپ خوش اور مطمئن رہے، ایک آزاد ملک کے آزاد شہری کی حیثیت سے سپردِ خاک ہوئے، آپ کی آخری زندگی میں خواہش تھی کہ اس ملک میں ایک مضبوط مرکزی حکومت قائم ہو، وہ بھی پوری ہوئی، آپ نے اس ملک کو ترقی کی شاہراہ پر چلتے ہوئے دیکھ کر خوش رہے، مگر آپ کی یہ بھی آرزو تھی کہ مسلمان اس ملک کے سیاسی اور قومی دھارے میں ہندوؤں کے ساتھ مل کر سربلند اور سرخرو رہیں، اس آرزو کے پورے نہ ہونے پر آپ بے چین اور بے قرار رہے، اور اس کا داغ اپنے ساتھ لے گئے، آپ نے جہاں اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے کی حتی الامکان کوشش کی، وہاں گاندھی جی کی بہت سی باتیں بھی اپنائیں، گاندھی جی سچے ہندو اور سچے ہندوستانی رہے، آپ بھی سچے مسلمان اور سچے ہندوستانی رہے، گاندھی جی کی شخصیت پھیل کر قومی اور پھر عالمی ہوگئی، اسلئے وہ ہندوستان پر اپنے بے مثال اثرات چھوڑ گئے، آپ کی شخصیت پھیل کر قومی اور عالمی نہ ہوسکی، ورنہ آپ بھی مسلمانوں کے گاندھی ہوسکتے تھے، آپ کی پوری زندگی سیاست میں گذری، یہ کہا جاسکتا ہے کہ آپ نے اپنے پیچھے کوئی کارنامہ نہیں چھوڑا، اس لئے ممکن ہے کہ آپ بھلا دیئے جائیں، مگر جب کبھی سچے مسلمان اور سچے ہندوستانی کے بقاء دوام کا

دربار سجایا جائے گا تو آپ کو اس میں نمایاں جگہ دی جائے گی، ہندو مسلمان کے باہمی اتحاد، یگانگت، موانست کی جب کبھی ایمانداری انہ اور مخلصانہ کوشش کی جائے گی، تو آپ کی تحریریں اور تقریریں یاد آئیں گی،

ڈاکٹر صاحب! میں اپنے استاذ محترم علامہ سید سلیمان ندوی کے بعد ذاتی طور سے آپ ہی سے متاثر ہوا، آپ کے ساتھ بہت ہی خوش گوار دن گذارے، پُرکیف راتیں بسر کیں، استاد رحمۃ اللہ علیہ کی طرح آپ نے بھی بڑی حد تک میری روح کو جگایا، میرے ضمیر کو جھنجھوڑا، میری ادنی بصیرت کو روشنی دکھلائی، ہندوستان کی گذشتہ تاریخ اور اس کے فارسی ماخذوں میں باہمی رواداری، فراخدلی، اور دلسوزی کے واقعات کو یکجا کرنے کی راہیں دکھائیں، اپنی لینت، مروّت، شرافت، اخلاق، وضعداری کا گہرا نقش میرے دل و دماغ پر قائم کیا، آپ یاد آئیں گے، اکثر یاد آئیں گے، برابر یاد آئیں گے، ذہن کے ظلمات میں آپ کی گذشتہ باتوں سے روشنی بھی ملتی رہے گی، سلام، ہزاروں سلام، لاکھوں سلام، الوداع، الوداع، دعا ہے کہ آپ خداوند تعالیٰ کی رحمتوں کی کوثر اور اس کی برکتوں کی تسنیم سے اب سیراب ہو رہے ہوں، آپ نے اپنے مذہبی جذبات کی بنا پر مسلمانوں کے مسائل سے نہ صرف دلچسپی لی، بلکہ اُن کو حل کرنے میں جذباتی طور پر اندر اندر گھٹتے گیا بلکہ جلتے رہے، آپ اپنے ان مذہبی اور ملی جذبات کا جو توشہ ساتھ لے گئے ہیں، اُن کی بدولت خدا کرے جنت کی حوروں نے آپ کا خیر مقدم کیا ہو آمین ثم آمین،

......٥-٥......

تأثراتِ دارالمصنّفین

از جناب شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی

افسوس ہے کہ ملک وملت کی وہ شمع جو ایک عرصہ سے جھلملا رہی تھی ہمیشہ کیلئے خاموش ہوگئی، اور ڈاکٹر سیّد محمود صاحب نے ۲۸ ستمبر کی صبح کو اس جہان فانی کو الوداع کہا، ڈاکٹر صاحب جیسی جامع اوصاف شخصیتیں کم پیدا ہوتی ہیں، ان میں مذہب وسیاست، علم وفن اور تہذیب وشرافت کا نہایت متناسب اجتماع تھا، شرافت اور وضعداری کا تو مجسّم پیکر تھے، آخر کے چند برسوں کو چھوڑ کر جب وہ بالکل معذور ہوگئے تھے، ان کی پوری زندگی ملک وطن اور قوم وملت کی خدمت میں گذری، وہ ابتداء سے کانگریسی اور پنڈت جواہر لال نہرو کے پرانے رفیق تھے، ان دونوں کے تعلقات اتنے عزیزانہ تھے کہ ڈاکٹر صاحب پنڈت جی کے گھر کے ایک فرد سمجھے جاتے تھے، جنگ آزادی میں اُن کے دوش بدوش حصہ لیا، اور اُن کے ساتھ قید وبند کی مصیبتیں جھیلیں، آزادی کے بعد صوبہ بہار کے وزیر تعلیم پھر مرکزی حکومت میں وزیر مملکت برائے امور خارجہ ہوئے، چند سال پہلے تک راجیہ سبھا کے ممبر تھے، پھر اپنی معذوریوں کی وجہ سے اس سے بھی الگ ہوگئے تھے، ان کا آخری کارنامہ مجلسِ مشاورت کا قیام ہے، اس کو انھوں نے ہندو مسلم اتحاد، ان دونوں کے درمیان غلط فہمیوں کے ازالہ اور ملک وملت کی مشترک خدمت کے لئے قائم کیا تھا، اور ابتداء میں بڑی گرمی سے اس کے کاموں میں حصہ لیا، اور ضعف پیری کے باوجود ملک کے مختلف حصوں کا دورہ کیا، جس کا ملک کی فضا پر بہت اچھا اثر پڑا، لیکن پھر مجلسِ مشاورت کی پالیسی میں بعض ارکان سے اختلاف کی بناء پر اس سے الگ ہوگئے اور چند دنوں سے شیعہ سُنّی اتحاد کی کوشش میں تھے،

وہ اگرچہ ابتداء سے کانگریسی، اور اس کے نہایت ممتاز رہنما تھے، اور آخر تک اس پر قائم رہے، لیکن اس سے ان کے مذہبی وملی جذبہ میں فرق نہیں آیا تھا، ان کے دل میں مذہب وملت کے لئے

بھی وہی تڑپ تھی، جو ہندوستان کی آزادی کے لئے تھی، مگر اُن کی رائے میں مسلمانوں کے مسائل کا حل اکثریت سے مل کر اور اُن کی مدد ہی سے ہو سکتا تھا، مجلسِ مشاورت کے قیام کا مقصد بھی یہی تھا جو پورا نہ ہو سکا، وہ عملاً پابند مذہب تھے، اُن کو مولانا آسی سکندر پوری سے عقیدت تھی، بلکہ شاید اُن سے بیعت بھی تھے، اس لئے ابتدا ہی سے ان پر مذہب کا اثر اور تصوف کا ذوق تھا، اور آخر میں یہ رنگ اور گہرا ہو گیا تھا، مولانا آسی کا عارفانہ کلام بڑے تاثر سے پڑھا کرتے تھے، بزرگوں سے عقیدت رکھتے تھے، اور اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے،

اس مختصر تحریر میں اُن کے اوصاف و کمالات اور سیاسی و قومی خدمات کی تفصیل کی گنجائش نہیں، اس پر بہت سے لکھنے والے لکھیں گے، معارف میں بھی انشاء اللہ مستقل مضمون لکھا جائے گا، اس وقت دارالمصنفین سے ان کا تعلق دکھانا مقصود ہے، اُن کے اور سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے گہرے دوستانہ تعلقات تھے، وہ علمی ذوق بھی رکھتے تھے، اس لئے دارالمصنفین سے بھی اُن کو بڑا لگاؤ تھا، وہ اسکی مجلس انتظامیہ کے پرانے رکن تھے، پھر اُس کے صدر ہو گئے تھے، اور پابندی سے اس کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے، سیو گھر پور ضلع اعظم گڈھ میں اُن کی قرابت اور جائداد تھی، اس سلسلہ میں بھی اُن کا اعظم گڈھ آنا ہوتا رہتا تھا، اور قیام دارالمصنفین میں رہتا تھا، جب تک رہتے، بڑی پُر لطف صحبت رہتی، سیاسی، علمی، مذہبی، ہر قسم کے مسائل پر گفتگو ہوتی، اُن میں اُن کے بعض تفردات بھی تھے، اُن کا حافظہ بڑا قوی تھا، ان کا دماغ پرانی یادوں کا خزانہ تھا، اس سے ہم لوگوں کے معلومات میں بھی اضافہ ہوتا تھا، سید صاحب اور مولانا مسعود علی صاحب کے بعد ان کی حیثیت دارالمصنفین کے بزرگ خاندان کی ہو گئی تھی، اور وہ ہم لوگوں سے اپنے عزیزوں ہی کی طرح محبت کرتے تھے،

اُن کی ذات سے دارالمصنفین کو بڑے فوائد پہنچے، انھوں نے اپنے اثر سے ایک مرتبہ دس ہزار اور دوسری مرتبہ پچاس ہزار سعودی عرب سے دلوائے، وہ کہا کرتے تھے کہ میں چاہتا ہوں کہ دارالمصنفین

مالی حیثیت سے اس قدر مضبوط ہو جائے کہ پھر اس کو کسی کی امداد کی احتیاج باقی نہ رہے، اس کے لئے انھوں نے کویت جانے کا پروگرام بنایا تھا، ہم لوگوں نے عرض کیا کہ اس عمر میں آپ سے اتنا لمبا سفر کیسے ہو سکے گا، فرمایا تبدیلی آب و ہوا سے میری صحت زیادہ ٹھیک رہتی ہے، اور زیادہ تر و تازہ رہتا ہوں، اُن کا یہ بھی ارادہ تھا کہ دارالمصنفین میں قیام کر کے اپنے پیش نظر علمی کاموں کو پورا کریں گے، دارالمصنفین کے متعلق اور بھی منصوبے تھے، مگر یہ سارے منصوبے دل ہی میں رہ گئے، اور ان کا وقت آخر ہو گیا، وہ پرانی یادگاروں میں تھے، اس لئے کانگریس اور مرکزی حکومت کے ارکان دونوں انکا احترام کرتے اور اُن کی باتوں کا بڑا لحاظ کرتے تھے، مسز اندرا گاندھی خاص طور سے اُن کو اپنا بزرگ سمجھتی تھیں، اس اثر سے انھوں نے دارالمصنفین کو بڑا فائدہ پہنچایا، افسوس کہ یہ سہارا ختم ہو گیا، لیکن اصلی اور حقیقی سہارا تو ایک ہی ہے وعلیہ التکلان

اس ضعف پیری میں بھی جب کہ اُن کے قویٰ جواب دے چکے تھے، ان کا دماغ پورا کام کرتا تھا، اور ان کی ہمت، حوصلے، اور قوتِ عمل کو دیکھکر حیرت ہوتی تھی، مگر ان کے سارے ہم نوا اور ہم صفیر اٹھ چکے تھے اور وہ اس انجمن میں اپنے کو تنہا محسوس کرتے تھے، ہندوستان کے حالات سے بھی بہت شکستہ خاطر تھے، اور حسرت و افسوس کے ساتھ ان کا ذکر کیا کرتے تھے، ادھر کئی مہینوں سے اُن کی حالت خراب تھی، جولائی میں تو زندگی سے بالکل مایوسی ہو گئی تھی، اُن کی حالت سُن کر راقم اور صباح الدین صاحب ان کو دیکھنے کے لئے دلی گئے تھے، مگر ہمارے دورانِ قیام میں برابر بیہوش رہے اور ہوش میں ان سے ملاقات نہ ہو سکی مگر اس کے بعد پھر حالت سنبھل گئی تھی، لوگوں کو پہچاننے اور باتیں کرنے لگے تھے، شروع اکتوبر میں بعض ضرورتوں سے پھر ہم دونوں کا دلی سفر ہونے والا تھا، خیال تھا کہ اس مرتبہ ہوش میں ملاقات ہوگی کہ ۲۸ ستمبر کی صبح کو دلی ریڈیو اسٹیشن نے اُن کی وفات کی غمناک خبر سنائی، اور یہ آرزو دل ہی میں رہ گئی، البتہ اُن کے مزار پر حاضری ہوگی، اُن کی وفات دارالمصنفین کے لئے تنہا قومی نہیں بلکہ ذاتی حادثہ بھی ہے، اللہ تعالیٰ ملک و وطن کے اس خادم اور قوم و ملت کے اس غمخوار کی مغفرت اور عالم آخرت میں مقام محمود عطا فرمائے، البقاء للہ وحدہٗ

(معارف اکتوبر سنہ ۱۹۷۱ء)